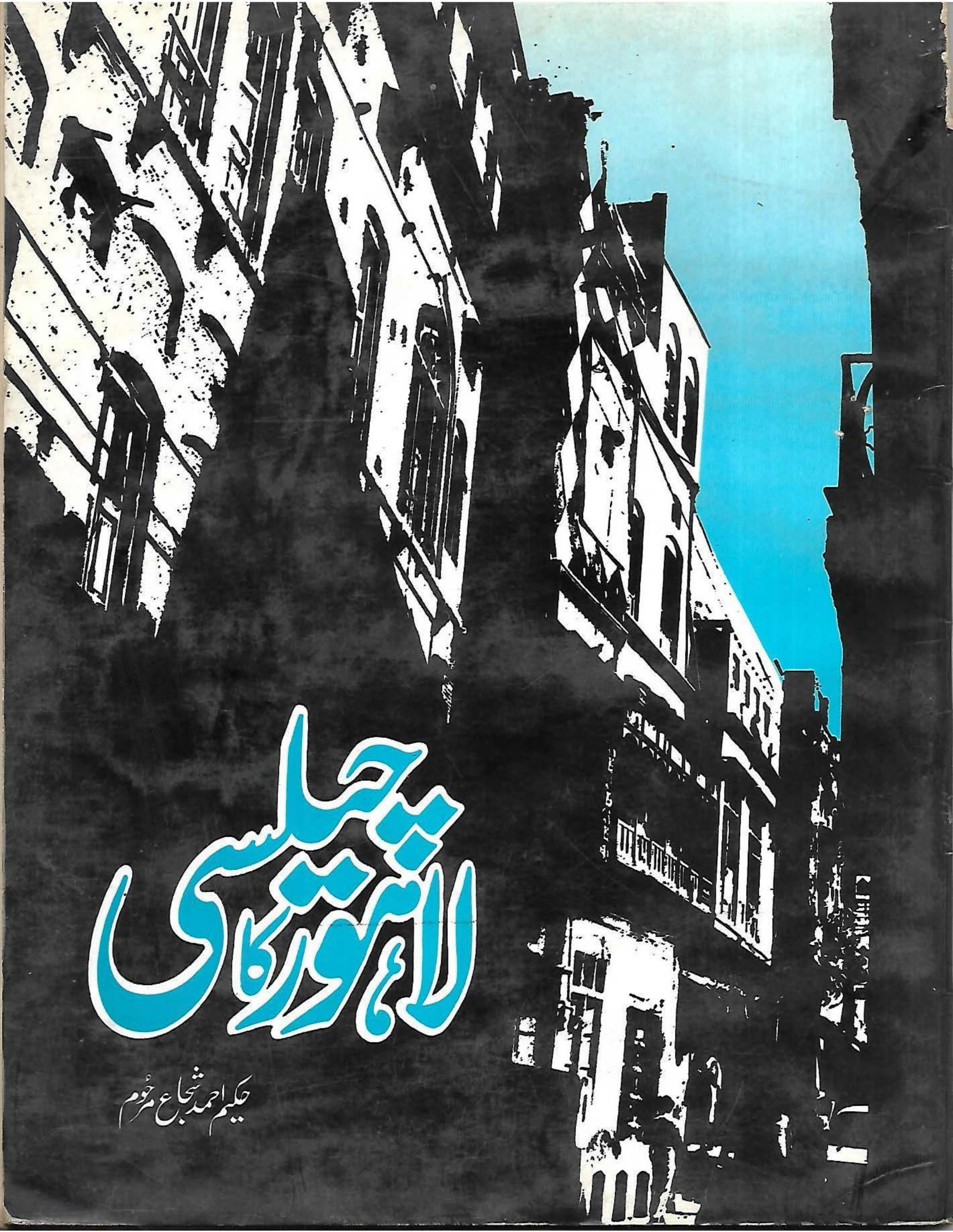


لاہور کا چیلسی

حکیم احمد شجاع مرحوم

چلسی لاہور کا

حکیم احمد شجاع مرحوم

پیکجز لمیٹڈ لاہور

کتاب	لاہور کا چیلسی
مصنف	حکیم احمد شجاع مرحوم
ٹائٹل ڈیزائن	مرتضیٰ احمد قریشی
کتابت	شیر زمان
تاریخ اشاعت	دسمبر ۱۹۸۸ء
مقام طباعت	رہبر پرنٹرز ۱۹ اے ایبٹ روڈ۔ لاہور
ناشر	پیکیجز لمیٹڈ لاہور۔ ۵۴۷۶۴

انتساب

باسمہٖ تعالیٰ

ہماری تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی، فنی اور سیاسی شناخت کا دوسرا نام لاہور ہے اسی وجہ سے ہمارے اکابرین کی اکثریت نے اس شہر کو مسکن بنا کر ہمارے فکر و شعور کی تہذیب کی۔

حکیم احمد شجاع مرحوم نے اسی تاریخ کے ایک اہم باب کو "لاہور کا چیلسی" کے عنوان سے خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

حکیم صاحب مرحوم لاہور کے معروف حکیم خاندان کی اہم شخصیت تھے۔ ہمارے ننھیال فقیر خاندان سے قریبی رشتہ داری کی وجہ سے وہ ہمارے بھی بزرگ تھے اور ہمیشہ بزرگانہ شفقت سے پیش آتے۔

ان کے آخری دس سالوں میں، مجھے ان کا کافی قرب حاصل رہا۔ انتقال سے دو سال پیشتر باقاعدگی کے ساتھ انہوں نے مجھے کلامِ اقبال سبقاً پڑھایا۔

اس قرب اور شفقت کے نام جو انہیں ہم سے رہی ہے۔

بابر علی

سیّد بابر علی

ابتدائیہ

لندن کے جنوب مغرب میں ایک دلکش خطہ ہے، جسے CHELSEA کہتے ہیں۔ لندن کے وسط میں ایک اور جگہ ہے جسے BLOOMSBURY کہتے ہیں BLOOMSBURY یوں تو یہ ایسی جگہ ہے، جہاں کے رہنے والے علم و ادب سے شغف رکھتے ہیں، لیکن ان میں وہ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ نہیں، جو چیلسی کے رہنے والوں میں ہے، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو پرنس مسعود رضا خان بھی چیلسی کے گرد و نواح ہی میں رہتے ہیں

میرے محترم دوست عاشق حسین بٹالوی نے بھاٹی گیٹ کو "لاہور کا چیلسی" بنا دیا ہے، اگر اس استعارے کو پلٹ دیا جائے۔ تو "چیلسی" لندن کا بھاٹی گیٹ ہے۔ البتہ دونوں میں مماثلت بہت ہے، جو اکابر اصحاب قلم اور ارباب ذوق بھاٹی گیٹ میں رہے ہیں۔ ان کی داستان تو حکیم احمد شجاع مرحوم نے اپنی اس کتاب میں بیان کر دی ہے۔ لاہور کا یہ حصہ اپنے علمی اور ادبی ہنگاموں کی وجہ سے مشہور تھا۔ انھی ہنگاموں سے ہمارے نئے ادب کا مزاج بنا ہے اور انھی صحبتوں سے ہمارے مزاج میں نئے ادب کا احترام اور حساسیت پیدا ہوئی ہے۔ اس کتاب کی خوبی ہے کہ اس میں ابھرتے ہوئے ناموں کا بھی ذکر ہے، مثلاً محمد طفیل صاحب کے متعلق یہ بیان ہے کہ وہ "اس زمانے" میں ایک اچھے خوشنویس تھے۔ بعد میں مدیر "نقوش" کے طور مشہور ہوئے

اس کتاب میں ایک نامور ادیب جناب غلام عباس مرحوم کا ذکر نہیں جو بھاٹی گیٹ میں رہتے تھے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ غلام عباس مرحوم نے احمد شجاع صاحب کی زندگی میں وہ شہرت نہیں پائی تھی جو انہیں بعد میں ایک بے مثال ادیب کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر محمد اجمل

پیکیجز لمیٹڈ لاہور ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء

لاہور کا چیلسی

یکم جون ۱۹۶۴ء کو بی بی سی لندن سے میرے ایک بہت ہی عزیز دوست ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور مصوروں کے اس مشہور مسکن کے متعلق جو "چیلسی" سے موسوم ہے اور لندن کے مضافات میں واقع ہے ایک نہایت بصیرت افروز اور پُر از معلومات مقالہ نشر کیا جس کے یہ چند اقتباسات اس مضمون کو قلمبند کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔

"چیلسی کی فضا لندن کے دوسرے محلوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں قدم قدم پر یوں محسوس ہوتا ہے گویا ماضی دوبارہ زندہ ہو کر مرئی صورت میں سامنے آگیا ہے۔ ادیبوں، شاعروں، مصوّروں اور فن کاروں کے مکان اس کثرت سے یہاں ہیں کہ یہ شرف غالباً لندن کے کسی اور محلے کو حاصل نہ ہو گا۔"

"یہ صحیح ہے کہ اب قدیم روایات کی پابندی اس شدت سے نہیں کی جاتی اور ادباء و شعراء کا شیرازہ ایسا بکھرا ہے کہ یہ لوگ لندن کی گنجان آبادی کو چھوڑ کر یہاں سے تیس تیس چالیس چالیس میل دُور جا کر آباد ہو گئے ہیں، لیکن اس حالت میں بھی چیلسی کی شان کسی حد تک قائم ہے۔ آج بھی لارڈ برٹرنڈ رسل جیسے شہرہ آفاق مصنف، سر مائیکل ریڈ گریو جیسے نامور ایکٹر، آگسٹس جان جیسے بلند پایہ مصور اور جان آئر لینڈ جیسے مشہور عالم مغنی چیلسی میں رہتے ہیں"۔

"چیلسی میں اگرچہ اب نئی وضع قطع کے مکان بھی بنتے جا رہے ہیں، لیکن بیشتر گلی کوچوں میں مکانوں کی طرز تعمیر وہی پُرانی ہے جو آج سے سو دو سو سال پہلے تھی۔ اس کا تاریخی تسلسل ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے قائم ہے۔ قہوہ خانوں کے اندر جا کر دیکھیں تو ماحول کچھ انوکھا سا نظر آتا ہے۔ روشنی عمداً اس قدر مدھم کی گئی ہے کہ در و دیوار پر تاریکی کا سایہ پڑتا ہے چھت کے شہتیر اور کڑیاں نمایاں کر کے دکھائی گئی ہیں ساز و سامان سے بھی دور حاضر کا تکلف نہیں بلکہ ماضی کی قدامت ظاہر ہوتی ہے"۔

"آج سے چار سو سال پہلے چیلسی — ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو لندن شہر کے مضافات میں آباد تھا، جب سولھویں

صدی کے وسط میں سر ٹامس مور نے یہاں اپنا مکان بنوایا تو چیلسی کو پہلی مرتبہ شہرت حاصل ہوئی۔ پھر مشہور مصور ہینز ہولبائن یہاں آ کر مقیم ہوا۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں "گلیورز ٹریولز" کا مصنف سوفٹ یہاں رہتا تھا۔"

"چیلسی کی حقیقی شہرت کا دور اس وقت شروع ہوا جب ٹامس کارلائل اپنا وطن ماؤف چھوڑ کر لندن آیا اور چیلسی کے محلے میں رہنے لگا۔ یہ واقعہ ۱۸۳۴ء کا ہے۔ کارلائل پورے سینتالیس سال ایک ہی مکان میں رہا اور یہیں ۱۸۸۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے اپنی تمام کتابیں ایک ایک کر کے اسی مکان میں لکھی تھیں۔ خوش قسمتی سے یہ مکان ایک عجائب گھر کی طرح محفوظ کرا لیا گیا ہے۔ جس میں کارلائل کا گھریلو سامان کم و بیش اسی ترتیب سے رکھا ہے جیسا اس کی زندگی میں تھا۔ دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے تھے۔"

"ہانس سلون ایک اور عظیم الشان شخص تھا جس نے چیلسی میں رہائش اختیار کی۔ سلون سکوئر اور سلون سٹریٹ اسی کے نام سے منسوب ہیں۔ سلون پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا لیکن اس نے اپنی زندگی میں کتابوں کا ایک نایاب ذخیرہ جمع کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک کے نوادر بھی اکٹھے کئے تھے۔ مرتے وقت یہ تمام چیزیں وہ قوم کو دے گیا۔ چنانچہ اسی ذخیرہ سے برٹش میوزیم کی بنیاد رکھی گئی تھی۔"

"انیسویں صدی میں جو ادیب اور شاعر چیلسی میں آ کر آباد ہوئے ان میں جارج ایلیٹ، لی ہنٹ، ڈی جی روسیٹی، رسکن، سون برن، اور آسکر وائلڈ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے میدان میں یکتائے زمانہ تھے۔ جن مارلے اور ہنری جیمز جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے مصنفوں کے مکان بھی اسی محلے میں تھے۔ تھیٹر کی مشہور ایکٹرس ایلن ٹیری بھی یہیں رہتی تھی۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد۔ "جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہو گا۔"

"چیلسی کا ایک حصہ تو شہر کی آبادی سے ملحق ہے اور دوسرا حصہ دریائے ٹیمز کے کنارے تک پھیل گیا ہے۔ یہ حصہ بے حد خوبصورت ہے۔ فراخ اور کشادہ سڑک کے ساتھ ساتھ عین لب دریا ایک پختہ بند باندھ کر سیر گاہ بنائی گئی ہے جو وسعت میں کئی میل لمبی ہے۔ دریا کے اس طرف ایک بڑا وسیع پارک ہے جہاں گرمیوں کے موسم میں میلہ لگتا ہے، جو پورے چھ مہینے جاری رہتا ہے۔"

گذشتہ ماہ جون میں جب ڈاکٹر عاشق حسین لاہور آئے تو مجھ سے ملے۔ نو دس برس کے بعد انہیں دیکھ کر جو مسرت مجھے حاصل ہوئی اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ان ملاقاتوں کے دوران انہوں نے اور کئی علمی اور فنی مباحث کے علاوہ اس مضمون کا بھی ذکر کیا جو انہوں نے لندن کے چیلسی کے بارے میں بی بی سی لندن سے نشر کیا تھا اور پھر یہ قصہ سنایا کہ:۔

"میرے ایک انگریز دوست نے جو اپنی ملازمت کے سلسلے میں چند سال لاہور میں بھی بسر کر چکے ہیں باتوں باتوں میں مجھ

سے پُوچھا کہ لاہور کے کس محلے کو آپ لاہور کا چیلسی کہنا پسند کریں گے ؟ ان کے اس عجیب و غریب اور دلچسپ سوال نے لاہور کا پورا نقشہ میرے سامنے لا کھڑا کیا اور میں نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا کہ بھاٹی دروازہ ایک لحاظ سے لاہور کا چیلسی کہلانے کا مستحق ہے۔ انہوں نے پُوچھا "اس کی وجہ" ؟

"میں نے عرض کیا کہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے بھاٹی دروازہ لاہور کے ادباء و شعراء کا سب سے بڑا مسکن تھا۔ علامہ اقبال وہاں رہتے تھے۔ سر عبدالقادر نے وہیں سے اپنا مشہور رسالہ مخزن جاری کیا تھا۔ آغا حشر کا قیام بھی وہیں تھا۔ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی جب لاہور تشریف لائے تھے تو انہوں نے بھاٹی دروازے ہی میں قیام فرمایا تھا۔ چوہدری سر شہاب الدین جو پنجاب اسمبلی کے سپیکر ہونے کے علاوہ پنجابی زبان کے بہت بڑے شاعر بھی تھے بھاٹی دروازے ہی میں رہتے تھے۔ فقیر سید عزیزالدین اور فقیر سید نورالدین جو فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے بھاٹی دروازے ہی کے رہنے والے تھے۔ مشہور مرثیہ گو شاعر سید ناظر حسین ناظم لکھنوی کا مکان بھی بھاٹی دروازے ہی میں تھا غرضیکہ لاہور کی تاریخ میں ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ بھاٹی دروازہ نہ صرف ادیبوں اور شاعروں کا سب سے بڑا مسکن تھا بلکہ اکثر علمی اور ادبی محفلیں بھی وہیں گرم ہوتی تھیں"۔

"میرے انگریز دوست یہ جواب سُن کر بہت محظوظ ہوئے۔ لیکن مجھے خیال ہوا کہ اس ملک کے باشندوں نے تو چیلسی اور چیلسی کی قدیم روایات پر بیسیوں کتابیں لکھ ڈالی ہیں اور ہمارے یہاں کوتاہ قلمی کا یہ عالم ہے کہ کسی کو "لاہور کے چیلسی" یعنی بھاٹی دروازے پر ایک مضمون لکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی"۔

اس تذکرے کے بعد ڈاکٹر عاشق حسین نے مجھ سے کہا کہ کیا اچھا ہو کہ اگر آپ یہ کمی پوری کر دیں۔ آپ کا خاندان صدیوں سے بھاٹی دروازے کے اندر آباد ہے اور آپ اُس کی پُرانی روایات سے خوب واقف ہیں، اگر ان تمام ادیبوں، شاعروں اور دوسرے نامور لوگوں کے حالات کسی نہ کسی طرح محفوظ ہو جائیں، جو کبھی لاہور کے بھاٹی دروازے اور ٹکسالی دروازے کے اندر رہتے تھے تو یہ تحریر نہ صرف لاہور کے اس مشہور مقام کی تاریخی حیثیت کو منظر عام پر لے آئے گی بلکہ اس سے دنیائے علم و ادب کے ذہن میں ان لوگوں کی یاد بھی تازہ ہو جائے گی جو کبھی یہاں رہتے تھے اور جن کے دم قدم سے ان کے اپنے اپنے زمانے میں علم و فن کی شمع روشن رہی"۔

اب کہ عمر رواں کا کارواں زندگی کے سفر کی ستّر منزلیں طے کر چکا ہے اور ڈاکٹر عاشق حسین بھی اپنی تقریر میں انہیں نامور لوگوں میں سے دو چار ایسے بزرگوں کا ذکر کر چکے ہیں جو اس زمانے میں بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے اور جن کی یاد میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میں چاہتا ہُوں کہ وہ کمی پوری کر دوں جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے اور ان تمام ادیبوں، شاعروں اور دوسرے نامور لوگوں کے حالات مختصر طور پر لکھ دوں جو میرے سامنے بھاٹی دروازے اور ٹکسالی دروازے

کی حدود کے اندر رہتے تھے اور جن کے کارناموں کی درخشانی سے صرف لاہور ہی کی نہیں بلکہ سارے پنجاب کی قومی، مجلسی اور ثقافتی تاریخ کے اوراق منور ہیں اور جن کی زندگی کے کوائف ہماری پرانی تہذیب کے امتیازی آثار ہیں۔

لاہور ایک بہت ہی پرانا شہر ہے۔ تاریخ میں مذکور ہے کہ رام چندر جی کے بڑے بیٹے ـــــــــ لو ہونے لاہور آباد کیا اور کسو نے قصور۔ انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں لاہور کئی بار آباد ہوا اور آباد ہو کر اُجڑا۔ کبھی تو یہ شہر اس جگہ واقع تھا جہاں آجکل اچھرہ آباد ہے اور کبھی اس مقام پر جو اب نواں کوٹ کے نام سے موسوم ہے۔

بہرحال مغلوں کے زمانے میں لاہور اسی جگہ آباد تھا جہاں آجکل آباد ہے۔ جب شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر نے اپنے بھائیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے لاہور کو اپنا عسکری مرکز بنایا تو اس وقت لاہور کا قلعہ تعمیر ہوا یہ جگہ لاہور کے شمال مغرب میں ایک وسیع و عریض اور اونچے ٹیلے پر واقع تھی۔ پنجابی زبان میں کسی مقام کی سطح مرتفع کو ٹبی کہتے ہیں اور اسی لیے لاہور کا وہ علاقہ جو مستی دروازے سے لے کر بھاٹی اور ٹیکسالی دروازوں کی حدود کے اندر واقع ہے "ٹبی" کہلاتا ہے۔ شاہجہان کے وقت میں لاہور تین حصوں میں منقسم تھا، ٹبی، میانی اور چوک دارا شکوہ۔

مزنگ کا اصلی نام

ٹبی کی حدود کے اندر ایک تو قلعہ تھا اور اس کے مضافات میں شاہی ٹکسال، بارود خانہ اور امرائے حکومت کی حویلیاں، میانی کا علاقہ چوک داراشکوہ اور ٹبی کے درمیان واقع تھا۔ آجکل یہ محض ایک قبرستان ہے۔ بلکہ میانی کا نام سنتے ہی آنکھوں کے سامنے قبرستان کا تصور آجاتا ہے۔ اس وقت شہر لاہور کا بیشتر حصہ اس مقام پر واقع تھا۔ شہر کا یہ حصہ نواں کوٹ سے شروع ہوکر ایک طرف بھاٹی دروازے تک اور دوسری طرف مزنگ جس کا اصلی نام "مہ زنگ" ہے اور اچھرے تک پھیلا ہوا تھا۔ چوک داراشکوہ شہر کے اس حصے کا نام تھا جو دہلی دروازے سے شروع ہوکر ایک طرف شاہو کی گڑھی اور میاں میر علیہ الرحمۃ کے مزار مقدس تک اور دوسری طرف بدھو کے آوے سے لے کر باغبان پورے تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے کہ اس مقام کی اہمیت کا اندازہ ہوجاتے جو اس وقت ٹبی کہلاتا تھا اور جس کی حدود میں وہ علاقہ شامل ہے جو بھاٹی دروازے سے لے کر ایک طرف ٹکسالی دروازے تک اور دوسری طرف ہیرا منڈی میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی سے گزر کر مستی دروازے تک پھیلا ہوا ہے کہ یہی علاقہ اس مضمون کا موضوع ہے۔

ہاں یہ کہہ دینا بھی لازم ہے کہ بھاٹی دروازہ کا نام اصل میں بھٹی دروازہ تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں مغلوں کی سلطنت سے پہلے بھٹی قوم کے جنگجو دلیروں نے فتح ملتان کے بعد لاہور آکر پڑاؤ ڈالا تھا۔ امتدادِ زمانہ سے بگڑتے بگڑتے بھٹی دروازہ بھاٹی دروازہ ہوگیا۔ بھاٹی دروازے کی تاریخی حیثیت سے قطع نظر چونکہ مجھے اس علاقے کی محض اُن سرگرمیوں کا ذکر کرنا ہے جن کی بنا پر ڈاکٹر عاشق حسین نے اسے لاہور کے چیلسی سے موسوم کیا ہے اس لیے میں اب اس مضمون کے اصلی موضوع

کی طرف آتا ہوں۔

جب بھاٹی دروازے کے اندر داخل ہوں تو کچھ دُور چل کر بائیں طرف ایک کوچہ ہے جسے کوچہ پٹرنگاں کہتے ہیں آج سے کوئی ساٹھ ستر برس پہلے اسی کوچہ کے ایک مکان میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جیسے نامور ماہرالسنۂ علوم شرقیہ کے استاد مولوی اصغر علی روحی رہتے تھے یہ مجمع کمالات تھے اور سرچشمہ ہدایت و رشد اُن کے درس کلام مجید کا شہرہ دور دور تھا۔ بعد میں انہوں نے گمٹی بازار میں بھی قرآن مجید کے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ بڑے پاک باطن اور فرشتہ صورت انسان تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جن کی صورت دیکھ کر اسلامی سیرت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جو بعد میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اور اس زمانے میں جب تک اُن کا تعلق نارمل سکول لاہور سے رہا اس کوچے کے قریب ایک مکان میں رہتے تھے اور ان کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے مولانا روحی کی شاگردی کے فیض ہی سے عربی اور فارسی علوم میں وہ دستگاہ حاصل کی جو آگے چل کر ان کی ناموری کا باعث ہوئی۔ اور جس کی بدولت انہوں نے ان دونوں زبانوں کی مشہور کتابوں اور دستاویزوں کے متعلق بڑی کاوش اور کوشش سے ریسرچ کی۔

مولوی محمد شفیع کے اہم علمی کارناموں اور تحقیقی دستاویزات کی فہرست اتنی طویل ہے اور ان کے مندرجات اتنے متقاضی تفصیل کہ اس مضمون میں ان کے بیان کی گنجائش نہیں۔ یہاں تو ان کے ذکر سے بس یہی مدعا ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی بھاٹی دروازے کے اندر اس علمی اور ادبی ماحول میں گزری جو اس مضمون کا موضوع ہے

اورینٹل کالج

اورینٹل کالج لاہور کے پرانے استادوں میں چار پانچ ایسے بزرگ ہیں جن کا نام اس وقت بھی لوگ عزت و احترام سے لیتے تھے اور جن کی یاد سے آج بھی اس احترام کے نقوش اُبھر آتے ہیں جو اس زمانے کے استادوں کے علمی تصرفات کا خروج متصور ہوتا تھا۔ اسے حسن اتفاق کہیے یا بھاٹی دروازے کی خوبی تقدیر کہ یہ سب بزرگ بھاٹی دروازے ہی کے اندر رہتے

تھے اور شاید اس لیے کہ یہ علاقہ اورینٹل کالج سے بہت ہی قریب تھا۔

اورینٹل کالج اپنے ابتدائی زمانہ میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی میں واقع تھا۔ اگر میں ان صاحبان علم و فضل کے کمالات گنوانے بیٹھوں تو ان میں سے ایک ایک بزرگ کے فضائل کی تفصیل کے لیے دفتر کے دفتر چاہئیں۔

یہاں اگر اورینٹل کالج کی مختصر سی تاریخ بیان ہوجائے تو مناسب ہے۔ انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں علوم شرقیہ کی ترویج کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر ایک انجمن قائم کی گئی تھی جس کا نام "انجمن پنجاب" تھا۔ اس کی داغ بیل ۲۱۔ جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں ڈالی گئی۔ ڈاکٹر لائبنٹز اس انجمن کی روح رواں تھے۔ اس انجمن کی سرپرستی اور ڈاکٹر لائبنٹز کی رہنمائی میں اس سال مجلس علوم شرقیہ کی بنیاد رکھی گئی اور اس جگہ جہاں لاہور سکھشا سبھا نے ۱۸۶۲ء میں ہیرا منڈی کے قریب ایک پاٹھ شالہ قائم کیا تھا اور جس میں محض ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی، یہ مدرسہ قائم ہوا۔ انجمن پنجاب نے اس پاٹھ شالہ کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور اس کے نصاب میں اردو عربی اور فارسی کی تعلیم کا اضافہ کر دیا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آجکل ہیرا منڈی میں حضرت پیر نوگزہ علیہ الرحمۃ کے مزار کے سامنے لاہور کارپوریشن کا ہسپتال واقع ہے۔ اس مکان کے مقابل راجہ دھیان سنگھ کی حویلی ہے جہاں گورنمنٹ کالج پہلے پہل قائم ہوا۔

مارچ ۱۸۷۲ء تک علوم السنہ شرقیہ کا یہ ادارہ اورینٹل سکول کہلاتا تھا۔ اس کے بعد اس کا نام اورینٹل کالج رکھ دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اورینٹل کالج کے لیے کھڑک سنگھ کی حویلی حاصل کر لی گئی۔ یہ حویلی لوہاری دروازے کے اندر نہال چند کے مندر کے سامنے واقع تھی۔ ۱۸۷۳ء میں اورینٹل کالج انارکلی میں کرائے کی ایک عمارت میں منتقل ہوگیا۔ ۱۸۷۶ء میں جب گورنمنٹ کالج کی عمارت مکمل ہوگئی تو اس کے لیے اس عمارت کا شمال مشرقی گوشہ مقرر ہوا اور ڈاکٹر لائبنٹز اس کے پہلے پرنسپل نامزد کیے گئے۔ اس وقت مولوی فیض الحسن سہارنپوری صدر مدرس عربی تھے اور مولوی عبدالحکیم کلانوری صدر مدرس فارسی یہ دونوں بزرگ بھاٹی دروازے ہی میں رہتے تھے جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس زمانے میں مفتی محمد عبداللہ ٹونکی صدر مدرس عربی تھے۔ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی بازار حکیماں میں منشی حاجی محمد کے مکان میں رہتے تھے۔

کوچہ پیڑنگاں سے کچھ آگے چلیں تو ایک گلی آتی ہے جو نائیوں کی گلی کہلاتی ہے اس کے کوتے میں ایک مکان تھا جس میں شیخ گلاب دین وکیل رہتے تھے۔ اس زمانے میں کسی کا وکیل ہونا اس کی قانون دانی کی سند متصور ہوتی تھی۔ شیخ گلاب دین سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور اردو زبان میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ انہوں نے قانون شہادت اور قانون رواج کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کوچے سے ذرا آگے چل کر دائیں طرف کو ایک کوچہ ہے جسے محلہ حلوئیاں کہتے ہیں اس کے بالمقابل وہ مکان ہے جہاں سر محمد اقبال رہتے تھے وہ کئی برس تک یہیں رہے اس سے ذرا آگے چلیں تو ایک محلہ آتا ہے جسے "چومحلہ"

کہتے ہیں اس میں اونچی مسجد کے خطیب مولوی علم الدین رہتے تھے جو اپنے علم و فضل کے باعث بہت مشہور تھے۔ اسی محلے میں آجکل مولانا غلام مرشد خطیب مسجد شاہی رہتے ہیں معارف دین سے جن کی آگاہی کی تعریف میں نے اقبال کی زبان سے بھی سُنی ہے اور جن کا درس قرآن مجید اب بھی مرجع راہروان راہِ ہُدیٰ ہے۔ اس سے کچھ دور آگے بازار کے بائیں طرف نور محلہ واقع ہے اور دائیں طرف محلہ شیش محل۔ نور محلے میں سید محمد شاہ وکیل رہتے تھے جو اس زمانے میں دیوانی قانون کے ماہر متصور ہوتے تھے انہوں نے پہلے تو ملتان میں وکالت شروع کی اور بعد میں لاہور چلے آئے اور اپنی محنت کی کمائی سے ایک عالیشان مکان اسی محلے میں تعمیر کیا۔ محلہ شیش محل میں ڈاکٹر محمد حسین رہتے تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد لاہور آگئے تھے وہ اور ڈاکٹر رحیم خان جن کی حویلی اب انار کلی کے قریب دھنی رام روڈ پر ٹریڈرز بنک سے ملحق واقع ہے اس زمانے کے بہت بڑے طبیب سمجھے جاتے تھے ڈاکٹر محمد حسین اپنی طبی مہارت کے باعث وائسرائے کے آنریری فزیشن تھے اور ڈاکٹر رحیم خان اپنی جراحی کے کمال کی بدولت وائسرائے کے آنریری سرجن۔ انہی ڈاکٹر محمد حسین کے بڑے صاحبزادے منشی احمد حسین خان تھے جو اپنے زمانے کے بہت مشہور ناولسٹ اور شاعر تھے اور دو سو سے زائد کتابوں کے مصنف۔

شیش محل سے آگے چل کر رائے بہادر میلہ رام کی حویلی تھی جس کا دستبرد زمانہ سے اب نام و نشان بھی باقی نہیں رہا رائے بہادر میلہ رام کی حویلی بھاٹی دروازے کی عمارتوں میں نہ صرف اپنی وسعت اور شان کے اعتبار سے اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی، بلکہ خود رائے بہادر میلہ رام اور ان کے بعد ان کے بیٹے رائے بہادر رام سرن داس کی شخصیت ایسی تھی کہ اس علاقے کے لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے یہ سناتن دھرم کے پیرو تھے اور پرانی وضع کے رئیس۔ خود ادیب نہ تھے مگر ادیبوں اور شاعروں کے سرپرست تھے۔ ۱۸۸۰ء میں جب امرتسر سے لاہور تک ریل چلی اور لاہور کا اسٹیشن تعمیر ہوا تو لنڈا بازار والے میاں سُلطان، موچی دروازے والے میاں محمد بخش، دال گر اور رائے بہادر میلہ رام کی مشترکہ ٹھیکیداری ہی میں یہ کام انجام پایا۔ رائے بہادر میلہ رام اور رائے بہادر رام سرن داس جب تک زندہ رہے۔ ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کے تہوار بڑی شان سے مناتے رہے۔ ہر تہوار پر اپنی لال کوٹھی میں جو بھاٹی دروازے کے باہر واقع ہے محفل رقص و سرود سجاتے اور اپنے تمام احباب کو بلاتفریق مذہب و ملت بلا کر اس کی رونق بڑھاتے، سر محمد اقبال، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، میاں سراج الدین، راجہ نریندر ناتھ، راجہ سر دیا کشن کول، نواب لیاقت حیات خاں، نواب احمد یار خاں دولتانہ، سر سکندر حیات خاں، میاں محمد نصیر الدین خاں، خاں بہادر سید مراتب علی، سردار سندر سنگھ مجیٹھیہ اور سردار جوگندر سنگھ کو میں نے اکثر ان محفلوں میں اس طرح گھل مل کر بیٹھے دیکھا ہے کہ اب یہ داستان ایک قصہ پارینہ معلوم ہوتی ہے۔

اس کے سامنے ایک کوچہ ہے جسے موتی ٹبہ کہتے ہیں۔ اسی کوچے میں سر عبدالقادر رہتے تھے جن کا نام محتاج تعارف

نہیں۔ گلی کے سامنے ہی خلیفہ نظام الدین رہتے تھے، جو نارتھ ویسٹرن ریلوے کے صدر دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھے اور اپنی حساب دانی کے باعث بہت مشہور تھے۔ اسی محلے میں مولانا عبدالحکیم کلانوری بھی رہتے تھے۔ اس محلے سے ذرا آگے چلیے تو بائیں طرف کو ایک گلی آتی ہے جسے "پیر بھوے کی گلی" کہتے ہیں، اس کے کونے پر ایک مکان ہے جس میں ڈاکٹر الہ دین رہتے تھے یہ ان طبیبوں میں سے تھے جنہوں نے انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ایلوپیتھک طریقہ علاج میں بڑی مہارت حاصل کی۔ وہ کم سن بچوں کی بیماریوں کا کامیاب علاج کرنے میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور اپنی ہمدردی اور منکسر مزاجی کے باعث شہر کے غریب طبقے میں بہت مقبول تھے۔ کچھ دُور آگے جا کر یہ بازار جوگی محلے کو جا نکلتا ہے۔ مسٹر میراں بخش بیرسٹر ایٹ لاء جو جرنیل میراں بخش کے نام سے معروف تھے۔ انگلستان جانے سے پہلے اسی محلے میں رہتے تھے۔ انہوں اپنے ابتدائی زمانے میں ایک مشہور انگریز بیرسٹر مسٹر ریٹیگن اور اس کے بعد ایک اور انگریز بیرسٹر مسٹر رینلڈز کے ساتھ کام کیا یہ رینلڈز اسی مشہور و معروف افسانہ نگار جارج ڈبلیو ایم رینلڈز کے بیٹے تھے جنہوں نے "مسٹریز آف دی کورٹ آف لندن" لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اسی محلے میں اس زمانے میں منشی طاہر الدین بھی رہتے تھے یہ اپنے ابتدائی زمانے میں میاں سر محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا کے منشی تھے اور قانونی رموز سے خوب واقف۔ جب میاں سر محمد شفیع وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہو کر دہلی چلے گئے تو انہی منشی طاہر الدین کے مشورے سے ڈاکٹر سر محمد اقبال انارکلی میں اسی مکان میں چلے آئے جس میں سر محمد شفیع پریکٹس کیا کرتے تھے۔ سر محمد شفیع اپنے باقیماندہ مقدمات کی پیروی کا کام سر محمد اقبال کو سونپ گئے تھے اس لیے منشی طاہر الدین اس کام میں ان کے بہت ممد و معاون ثابت ہوئے۔ بعد میں انہوں نے ایک دوا "دل روز" کے نام سے ایجاد کی اور اس کے موجد ہونے کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اقبال کے دل میں اپنی بے لوث خدمت سے ایسا اعتبار پیدا کر لیا کہ انہوں نے اپنی وصیت میں اپنے دو اور دوستوں کے ساتھ ان کو بھی اپنی اولاد اور جائیداد کا ولی مقرر کیا۔ اس محلے میں ایک اور مکان ہے جس میں محمد طفیل ایک نوعمر صاحبزادے رہتے تھے۔ ان کو خوشنویسی کا بڑا شوق تھا۔ ان کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ آگے چل کر انہوں نے اسی محلے سے "نقوش" کے نام سے اُردو کا ایک مشہور اور کئی لحاظ سے لاثانی مجلہ شائع کرنا شروع کیا جو آجکل ایبک روڈ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی ضخامت مضامین کے تنوع اور کتابت کے تکلف کے اعتبار سے اپنے تمام پیشرو رسالوں سے مختلف اور ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعض شمارے تو ایسے ہیں کہ زمانہ مستقبل میں ایک تاریخی مقام حاصل کر لیں گے اور ان مصنفین کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے جنہیں موجودہ اُردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے میں حوالوں کی تلاش ہو۔

کوچہ لال حویلی

آگے چل کر شیخ سدو علیہ الرحمہ کے مزار مبارک کے پہلو میں محلہ کاغذیاں واقع ہے جس میں میرزا ناظر حسین ناظم شروع شروع میں رہتے تھے وہ بعد میں کوچہ فقیر خانہ میں جو اس بازار میں واقع ہے رہنے لگے اسی کوچہ میں میاں حسین بخش پہلوان رہتے تھے جو پہلوان بھی تھے اور سارے علاقے میں بااثر بھی۔ ہر شخص ان کی طاقت کا لوہا مانتا تھا اور کسی آوارہ منش شخص کو یہ مجال نہ تھی کہ اس بازار سے ہو گذرے۔ جب تک وہ زندہ رہے اس تمام علاقے میں نہ تو کوئی چوری کی واردات ہوئی اور نہ کوئی ایسا ہنگامہ و فساد جس سے یہاں کے لوگوں کا امن و سکون متاثر ہوا ہو۔

محلہ کاغذیاں کے بالمقابل لال حویلی کا کوچہ ہے جس میں سکھوں کی حکومت کے زمانے میں فقیر سید نورالدین اور فقیر سید شمس الدین رہتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ حویلی دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک حصے میں فقیر سید قمر الدین اور دوسرے حصے میں فقیر سید شہاب الدین رہنے لگے۔ آگے چل کر کوچہ دربار صاحب آتا ہے اس میں ایک مسجد اور اس سے ملحق ایک مکان واقع ہے جس میں وہ تبرکات عالیہ رکھے گئے ہیں جو فقیر سید عزیز الدین نے شاہ شجاع الملک سے حاصل کیے تھے۔ یہاں دن رات قرآن مجید کی تلاوت ہوا کرتی تھی اسی مکان کے قریب حافظ محمد حفیظ رہتے تھے جو اپنے زمانے میں قرأت کے ماہر تھے اور جن کے درس قرآن کا فیض عام تھا۔

چار مکان

اسی کوچے کے قریب پہلوانوں کا کوچہ واقع ہے جہاں پنجاب کے ایک مشہور پہلوان محمد حسن جو "حسا پہلوان" کے عرف عام سے مشہور تھے رہتے تھے۔ انہی کے بیٹے وہ حسن محمد حیات ہیں جو بعد میں سیاست ہند میں مولانا محمد علی کے

دست راست تھے اور اس کے بعد ریاست بھوپال لیجسلیٹو کونسل کے سیکرٹری ہوئے ان کی جوانی انہی گلیوں میں گذری ہے۔ کوچہ دربار صاحب بازار حکیماں میں واقع ہے۔

اس بازار میں چار مکان بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو میرے والد کے بڑے بھائی حکیم حسام الدین کا مکان جن کے بیٹے حکیم امین الدین تھے جو ان مسلمان طلبائیں سے تھے جو پہلے پہل انگلستان گئے اور جنہوں نے قانون کی سند لے کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ یہی وہ مکان ہے جس میں ۱۸۹۵ء میں میرے والد حکیم شجاع الدین کی سرپرستی میں اردو بزم مشاعرہ قائم ہوئی اور جس کے دوسرے مشاعرے میں اقبال نے جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے اپنی اُردو غزل پڑھی۔

حکیم حسام الدین لاہور اور امرتسر دونوں جگہ طبابت کے فرائض انجام دیتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں لاہور کا بازار حکیماں اور امرتسر کا کٹڑہ حکیماں انہی کے دم قدم سے آباد تھا۔ یہ مہاراجہ کشمیر کے طبیب خاص ہونے کے علاوہ ریاست ہائے پھلکیاں کے ہر والی ریاست کے طبی مشیر بھی تھے اور ان کی تشخیص مرض اور حذاقت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کی خدا پرستی اور پرہیز گاری کا یہ عالم تھا کہ لوگ دوا سے زیادہ ان کی دعا کے طالب نظر آتے تھے۔

حکیم شہباز دین کی بیٹھک

اس کے بالمقابل میرے دوسرے عم زاد بھائی حکیم شہباز دین کا مکان تھا۔ یہ مکان لاہور کی ادبی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس کی بیٹھک میں ۱۸۹۵ء سے ۱۹۲۲ء تک جب تک حکیم شہباز دین زندہ رہے ہر روز شام کو لاہور کے ادیبوں شاعروں، عالموں اور سیاست دانوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق یہ ایک قسم کا لٹریری کلب تھا۔ اس میں جو لوگ ہر شام کو باقاعدہ جمع ہو جاتے تھے ان میں مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، مولانا محمد حسن جالندھری، مولوی اصغر علی روحی، سید محمد شاہ وکیل، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، سر محمد اقبال، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین اور ماسٹر مولا بخش کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ اس محفل احباب میں کبھی کبھی سر محمد شاہ دین، سر محمد شفیع، فقیر سید افتخار الدین اور مرزا سلطان احمد بھی آ بیٹھتے تھے۔

انجمن حمایتِ اسلام

انجمن حمایت اسلام کے بانیوں اور ارباب نظم ونسق میں سے حاجی شمس الدین، خواجہ احمد بابا، مولوی حاکم علی اور خلیفہ حمید الدین بھی اس بزم احباب میں آکر مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کی گتھیاں سلجھاتے تھے اس مکان کے ساتھ ہی ہمارا مکان ہے جس میں میرے والد حکیم شجاع الدین رہتے تھے وہ اپنے زمانے کے مشہور طبیب فلسفی اور شاعر تھے۔ یہاں زیادہ تر ان کے وہ شاگرد دن بھر موجود رہتے تھے۔ جن کو طب شعر اور فلسفے میں ان کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تھی اس مکان سے ذرا آگے فقیر سید افتخار الدین کا مکان تھا وہ چونکہ اپنے زمانے میں فقیر خانے کے ایک ممتاز رکن اور سرکاری ملازمت کے اعتبار سے ایک جلیل القدر عہدیدار تھے۔ ان کے ہاں زیادہ تر سرکاری اہل کاروں کا مجمع رہتا تھا۔

اس مجمع کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں ان کے ہندو، سکھ، مسلمان دوست جو یا تو سرکاری ملازمت سے منسلک تھے یا ان کے خاندان سے دیرینہ تعلقات کے باعث وابستہ تھے۔ مل بیٹھتے تھے۔ ان میں لالہ ہرکشن لال، سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ، چودھری سلطان احمد، (فیض احمد فیض کے والد) مرزا سلطان احمد، میاں نصیر الدین (نواب امام الدین صوبیدار کشمیر کے بھتیجے) سید اقبال علی شاہ اور سید مراتب علی شاہ (نواب امام الدین خان صوبیدار کشمیر کے نواسے) قابلِ ذکر ہیں۔

مجلس شعروسخن

جب فقیر سید افتخار الدین لاہور میں آتے تو اپنے مکان پر ایک پرلطف مجلس شعروسخن جمائے رکھتے ان لوگوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے پنجاب کے بڑے بڑے جاگیردار اور امراء جب کبھی لاہور آتے تو وہ اس محفل میں ضرور شریک ہوتے

اس مکان کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ چودھری سلطان احمد اسی بازار میں اپنے بڑے بھائی چودھری نبی بخش کے ساتھ رہتے تھے وہ بیرسٹر ہونے کے علاوہ علم ریاضی میں بھی بڑی دست رس رکھتے تھے۔ اور ریاضی ہی میں کیمبرج سے ٹرائی پاس حاصل کر کے آئے تھے اسی بنا پر انہیں حکومت افغانستان نے اپنا وزیر مالیات مقرر کیا اور ان کی اس شہرت سے متاثر ہو کر مرزا ارشد گورگانی نے اس تقرر پر ان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کا یہ ایک شعر ان کی اس مہارت پر شاہد ہے جو انہیں علم ریاضی میں تھی۔

بڑھا دُ ہنر بُرد فضیلت گر تو ریاضی می بینی
زان روہست کہ خواہش کردہ والی افغانستان

مرزا سُلطان احمد

مرزا سلطان احمد ایک معزز سرکاری عہدہ پر فائز ہونے کے علاوہ بڑے پائے کے ادیب شاعر اور سخن فہم تھے۔ جب ابٹسن نے جو بعد میں صوبہ پنجاب کے لفٹینینٹ گورنر مقرر ہوئے اپنی سنیسس رپورٹ لکھی تو اس میں انہوں نے مسلمانوں کے خلاف بہت زہر اگلا۔ مرزا سلطان احمد نے اگرچہ اس زمانے میں انہیں کے ماتحت ایکسٹرا کمشنر تھے اس رپورٹ کے خلاف ایک مدلل اور بے ریا درشت رسالہ شائع کیا جس نے نہ صرف اِبٹسن کے دانت ہی کھٹے کر دیئے۔ بلکہ مرزا سلطان احمد کی غیرت وحمیت کا سکہ مسلمانوں کے دل پر بیٹھا دیا یہ بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ فقیر سید افتخار الدین کبھی کبھی اقبال کو بھی بڑے چاؤ سے کھینچ لاتے اور ان کی صحبت سے محفل کی رونق بڑھاتے۔

اقبالؒ سے عقیدت

فقیر سید افتخار الدین کے بڑے داماد فقیر سید نجم الدین جو میرے بھانجے بھی ہوتے ہیں اور بھتیجے بھی۔ اقبال سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور اقبال بھی ان سے بھائیوں کی سی محبت کرتے تھے۔ انہیں مراسم یگانگت کی یادگار میں فقیر سید نجم الدین

کے بیٹے فقیر سید وحید الدین نے " روز گار فقیر" کے نام سے دو جلدوں میں ایک نہایت ہی مفید، دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب لکھی ہے جسے دلدادگانِ اقبال حرزِ جان سمجھتے ہیں۔

فقیر سید افتخار الدین کے چھوٹے بھائی سید اقتدار الدین جو انہیں کے ساتھ رہتے تھے۔ اس زمانے کے مذاق کے مطابق شاعری کو اپنی شرافتِ نسبی اور وراثتِ علمی کے جزو سمجھتے تھے اور اس مشاعرے کے ہر اجلاس میں جو حکیم امین الدین کے مکان پر ہوتا تھا۔ ہمیشہ اپنی نئی غزل پڑھتے تھے۔ فقیر قمر الدین جو فقیر خانے کے بزرگ تھے اور جن کا مکان لال حویلی کہلاتا ہے۔ اگرچہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن سرکار دربار میں ان کی بڑی عزت تھی وہ بھی بہت اچھا شعر کہتے تھے اور قمر تخلص کرتے تھے۔

اس سے آگے چل کر آستانہ شریف کا کوچہ آتا ہے جس میں فقیر سید جمال الدین کی تعمیر کی ہوئی لال مسجد واقع ہے اور اسی کی بغل کے ساتھ ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جس میں فقیر خاندان کے جدِ امجد فقیر سید غلام محی الدین کا مزار ہے جو " نوشہ ثانی" کے لقب سے ملقب تھے۔ اسی احاطے میں فقیر سید عزیز الدین فقیر سید امام الدین فقیر سید نور الدین اور فقیر سید شمس الدین کے مزار بھی ہیں"

اسی کوچے میں اب سر سید مراتب علی شاہ کی اہلیہ محترمہ سیدہ مبارک بیگم کا امام باڑہ بھی ہے اور ان کے والد فقیر سید افتخار الدین کی جدی حویلی بھی، اسی حویلی سے ملحق فقیر سید امام الدین کی حویلی ہے جو سکھوں کے زمانہ میں قلعہ گوبند گڑھ کے صوبیدار اور شاہی خزانے کے محافظ تھے۔ اس کے سامنے فقیر سید حفیظ الدین کی حویلی میں مرزا اعظم بیگ ایک پرانی وضع کے رئیس رہتے تھے۔ ان کے بیٹے مرزا اسلم بیگ کو شعر و شاعری کا شوق وافر تھا اور وہ میر ناظر حسین ناظم کے تلامذہ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد اس قدر زیادہ دولت ان کے ہاتھ آئی کہ وہ لکھ لٹ مشہور ہو گئے

آبائی حویلی میں محفل مشاعرہ

اس لوٹ میں ان کے ذوقِ سخن کو بھی کافی مالِ غنیمت ملا۔ انہوں نے اپنی حویلی میں ایک محفل مشاعرہ قائم کی جس کے میر مشاعرہ ان کے استاد میر ناظر حسین ناظم تھے۔ اس بزم میں زیادہ تر موصوف کے شاگرد ہی اپنا کلام پڑھتے اور اپنے استاد سے

داد سخن پاتے۔ اس بزم مشاعرہ کے سیکرٹری فقیر سید امام الدین کے پوتے فقیر سید سعید الدین تھے جو میر ناظر حسین ناظم ہی کے شاگرد تھے اور بہت صاف شعر کہتے تھے اور اسی کوچے میں اپنے دادا کی حویلی میں رہتے تھے۔

شائد اس ناقدری کے زمانے میں یہ بیان کر دینا موجب تعجب ہو کر مرزا اسلم بیگ نے اپنے استاد میر ناظر حسین ناظم کے دولت کدے کو حقیقت میں دولت کدہ بنا دیا تھا۔ مرزا اسلم بیگ کی وفات کے ساتھ ہی اس محفل کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال اور ان بزرگوں کی محفل جن کے نام اوپر گنوائے گئے ہیں بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین ہی کی بیٹھک میں جمتی تھی۔ اور اس محفل کا مذاق مرزا اسلم بیگ کی بزم مشاعرہ سے کچھ الگ تھا۔ وہاں زیادہ تر ادبی و قومی مسائل کا چرچا تھا۔ اور اس محفل میں وہی کاکل و زلف کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اس کوچے کے بالمقابل میرے جد امجد حکیم عبداللہ انصاری کی بنائی ہوئی مسجد واقع ہے جس کی تعمیر کی تاریخ اس مصرعے سے نکلتی ہے۔ ع کرد باصدق ایں عبادت گاہ عبداللہ حکیم

انہی نے بازار حکیماں کی بنیاد ڈالی تھی اور اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا یہ گھر بنایا تھا۔ اس کے سامنے ہی حکیم خدا بخش کی حویلی تھی جس کا نام و نشان بھی موجود نہیں مگر اس کے کھنڈر میں ان کا مزار باقی ہے یہ اپنے زمانے میں بہت بڑے طبیب تھے اور اپنے تموّل اور فیاضی کے باعث مرجع خلائق۔

چند قدم آگے چلیں تو بازار کی بائیں طرف کوچہ فقیر خانہ آتا ہے جس میں فقیر سید ظفر الدین رہتے تھے اور ان کے سامنے ہی وہ مکان ہے جس میں میر ناظر حسین ناظم عمر بھر اقامت گزیں رہے۔ اس مکان سے ذرا آگے چل کر فقیر سید حسن الدین کا مکان اور امام باڑہ ہے۔ اس میں ان کے بڑے داماد سید سید علی شاہ رہتے تھے جن کی مصوّری کی شہرت اس امر کے باوجود کہ انہوں نے اسے ایک پیشے کی حیثیت سے کبھی اختیار نہ کیا محتاج بیان نہیں۔ بڑے بڑے مصور ان کی خدمت میں آتے اور ان سے رنگ آمیزی کا فن سیکھتے۔

مناظر فطرت کی عکاسی

مناظر فطرت کی جو صحیح عکاسی ان کے موئے قلم نے کی وہ کسی دوسرے مصوّر کی چابک دستی کو نصیب نہ ہوئی۔ ان کی سخن فہمی کا

یہ عالم تھا کہ جو اشعار بھی ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور ان کی تعداد حد شمار سے باہر ہے بڑے بڑے شعراء کے نتائج فکر کا آئینہ تھے، ان کی صحبت میں بیٹھ کر یہی محسوس ہونے لگتا کہ فطرت کے عجائبات کا ایک نگار خانہ ہے جس کے پٹ کھل گئے ہیں اور نوادر شعر و سخن کا ایک چمنستان ہے جس پر بہار آگئی ہے انہوں نے بڑی طویل عمر پائی اور قریب قریب ایک سو بیس سال کی عمر میں ابھی پچھلے ہی برس رحلت فرمائی۔

سیّد محمد لطیف جج

بازار میں آگے چل کر دائیں طرف فقیر سید عزیز الدین کی حویلی ہے جو ان کے بعد ان کے بیٹے فقیر سید جمال الدین کو ورثے میں ملی اور آجکل اس میں ان کا امام باڑہ واقع ہے۔ کچھ دور آگے چل کر کوچہ تحصیل آتا ہے جہاں اس زمانے میں لاہور کے تحصیلدار کی کچہری ہوا کرتی تھی۔ اس کچہری کے مقابل ایک مکان ہے جس میں دارالاشاعت پنجاب اور رسالہ "تہذیب نسواں" کے مالک سید ممتاز علی رہتے تھے۔ اور اس کوچے میں کچھ دیر کے لیے مولانا محمد حسین آزاد بھی رہے۔

اس کوچے کے مقابل ایک بازار ہے جسے اس زمانے میں سمیوں کا بازار کہتے تھے۔ جو آجکل جج بازار کہلاتا ہے۔ اسی بازار میں ایک طرف سر شہاب الدین کا مکان اور چھاپہ خانہ تھا اور دوسری طرف تاریخ لاہور کے مشہور مصنف سید محمد لطیف کی حویلی۔ وہ اس زمانے میں سیشن جج تھے۔ اور اسی نسبت سے یہ بازار اب جج بازار کہلانے لگا ہے۔ اس بازار میں ایک اور بزرگ بھی رہتے تھے جن کا نام مولوی عبدالغنی تھا، وہ لکھنؤ میں جج کے عہدے پر فائز تھے۔ انہی کے بھانجے میاں شمس الدین کے مکان میں آغا حشر کا ایک مدت تک قیام رہا اور یہیں ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔

مدرسہ نعمانیہ

اس مکان سے ذرا آگے چل کر پروفیسر عبدالغنی کا مکان تھا جو اپنے زمانے میں شیکسپیئر کے اسلوب نگارش کی تفہیم

میں بڑی مہارت اور شہرت رکھتے ۔ بعد میں اپنے علم و فضل کی بدولت اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوتے ۔
کچھ دور آگے چلیں تو وہ بازار آتا ہے جو آجکل ٹبی بازار کہلاتا ہے ۔ زمانے کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں ۔مغلوں کے زمانے میں اور اس کے بعد سکھوں کے عہد میں بھی اس بازار میں عمائد حکومت کی حویلیاں تھیں ۔مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس زمانے میں اس بازار میں زیادہ تر طوائفوں ہی کے ڈیرے تھے ہاں اس بازار میں ایک عالیشان مسجد بھی ہے اور انجمن نعمانیہ کا مدرسہ بھی جس میں علوم اسلامیہ کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ اس مسجد کو دیکھ کر ایک دن میر ناظر حسین ناظم نے غالب کا یہ مصرعہ برجستہ دہرایا اور سننے والوں نے لطف اٹھایا ؂ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

مولوی محرم علی چشتی

جہاں یہ بازار ختم ہوتا ہے اس کے بائیں طرف شیخوپوریوں کا بازار ہے اس کے کونے پر ایک بازار ہے جس میں اس زمانے میں مولوی محرم علی چشتی رہتے تھے یہ پنجاب کے ایک پرانے اخبار "رفیق ہند" کے ایڈیٹر تھے اور رفتہ رفتہ ان کا اثر اور رسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جسے وہ چاہتے لاہور میونسپل کمیٹی کا ممبر منتخب کرا لیتے ۔ اس لیے لوگ انہیں "کنگ میکر" کہتے تھے ۔ بعد میں یہ اس مکان سے اٹھ کر ہیرا منڈی کے عقب میں ایک وسیع حویلی میں رہنے لگے ۔ بڑے علم دوست تھے اور خود بھی اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر ۔ حضرت منان شاہ کابلی کے مرید تھے ۔
ان کے ہاں اکثر حال و قال کی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں ۔ ان کا دستر خوان اس قدر وسیع تھا کہ مشائخ کرام اپنے مریدوں کے لاؤ لشکر کے ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے سے آتے اور انہیں کے ہاں قیام فرماتے ۔ اپنے ابتدائی زمانے میں انگریزی تعلیم کے بہت مخالف تھے اور اس لیے سر سید احمد خاں کی اس باب میں ہر تحریک کی مخالفت کرتے رہے مدرسہ نعمانیہ جس کا ذکر اوپر آیا ہے انہیں کی جد و جہد سے ایک زمانے تک منبع علم و فضل بنا رہا ۔
اس مکان کے قریب ہی ایک پرانی حویلی تھی جس میں مرزا عبدالرحیم رہتے تھے ۔ ان کے بڑے صاحبزادے مرزا محمد سعید ایم اے انگریزی زبان میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ میں نے گورنمنٹ کالج کے ایک انگریز پروفیسر مسٹر لینگ ہارن کو یہ کہتے سنا کہ انہوں نے مرزا محمد سعید کا سا صحیح انگریزی بولنے اور لکھنے والا کوئی ہندوستانی طالب علم یا استاد نہیں دیکھا ۔

مجھے مرزا محمد سعید کی شاگردی کا فخر اس زمانے میں حاصل ہوا جب وہ ماڈل سکول میں مدرس تھے بعد میں انڈین ایجوکیشن سروس سے منسلک ہوکر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کے دو ناول "خواب ہستی" اور "یاسمین" اردو زبان میں بھی اعجاز کا درجہ رکھتے ہیں یہ ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے بلند پایہ انگریزی مضامین کو اردو زبان کا جامہ پہنا کر شیخ عبدالقادر کے رسالے "مخزن" کی محفل میں سجایا اور بڑا نام پایا۔

پروفیسر محمد سعید دہلی کے رہنے والے تھے تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے آئے اور دو برس گذرے ہیں کہ انہوں نے اسی (۸۰) برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی ابتدائی زندگی کا بیشتر حصہ چونکہ بھاٹی دروازے کے اندر ہی گزرا ہے اس لیے ان کی شہرت کا اسی علاقے کے سر سہرا ہے۔

شیخو پوریوں کے بازار میں بھی شیخ عزیز الدین کی کٹڑی تک طوائفوں ہی کے مکان تھے جن میں سے اکثر اپنے فن کے کمال کے باعث بہت مشہور تھیں۔ شیخ عزیز الدین کی کٹڑی میں مسجد ایاز کے قریب ایک مکان تھا جس میں مرزا ارشد گورگانی ایک مدت تک مقیم رہے یہ سلاطین مغلیہ کی اولاد میں سے تھے اور اسی نسبت کے باعث گورگانی کہلاتے تھے۔ بڑے بلند پایہ شاعر تھے اور درس و تدریس کے مشاغل کو اپنا سرمایہ امتیاز سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں لاہور کے جن نوجوانوں کو شعر و شاعری سے وابستگی تھی وہ یا تو اپنے کلام کی اصلاح ان سے لیتے یا میر ناظر حسین ناظم سے۔

یہ بات کسی قدر وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شروع شروع میں یہی دو بزرگ پنجاب میں اردو زبان کی ترویج کا باعث ہوئے مولانا محمد حسین آزاد بھی انہیں کے معاصر تھے اور انہوں نے اردو شاعری کو جس نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ان کی اس کوشش میں یہ دونوں بزرگ ہمیشہ ممد و معاون رہے۔ منشی احمد حسین خان جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ انہیں مرزا ارشد گورگانی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اقبال اگرچہ بذریعہ خط و کتابت ابتدائی غزلوں کی اصلاح حضرت فصیح الملک مرزا داغ سے لیتے رہے لیکن لاہور میں وہ اپنی غزلیں مرزا ارشد گورگانی ہی کو دکھایا کرتے تھے۔

ٹبی بازار کے چوک سے جو راستہ ہیرا منڈی کو جا نکلتا ہے اس کے وسط میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی ہے اس بازار میں بھی اس زمانے میں زیادہ تر طوائفیں ہی رہتی تھیں آگے چل کر بازار دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک راستہ تو لاہور ڈاکخانہ سے گزر کر چوک سرجن سنگھ کو جا نکلتا ہے اور دوسرا بارود خانے سے ہوکر چونے منڈی کو جہاں شیخوپورہ کے راجہ دھیان سنگھ رہتے تھے۔

میاں امیرُالدّین

بارود خانے کے بازار میں میاں شمس الدین اور میاں نظام الدین دو علم دوست اور معارف پرور بزرگ رہتے تھے۔ اور اسی علم دوستی کے باعث ان کا دولت کدہ ان ادیبوں اور شاعروں کا ملجا و ماویٰ تھا جو ان کی فیاضی کے سہارے اپنی زندگی کے اوقات بے فکری سے بسر کرتے تھے میاں امیرالدین جنہوں نے پنجاب کی سیاست میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیا۔ میاں شمس الدین کے چھوٹے بھائی میاں جلال الدین کے صاحبزادے اور پنجاب کے سابق گورنر میاں امین الدین کے بڑے بھائی ہیں اور میاں محمد اسلم جن کا نام ایک ناولسٹ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں، میاں نظام الدین کے بیٹے ہیں۔ محمدالدین تاثیر جن کے علم وفضل کا چرچا اور اردو اور انگریزی میں جن کا اسلوبِ نگارش آج بھی طلباء کے دل کو گرما دیتا ہے اور جو ایک مدت تک اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بارود خانے ہی میں رہتے تھے۔

نیرنگِ خیال

حکیم یوسف حسن جو "نیرنگ خیال" جیسے مقبول عام اردو رسالے کے مالک بھی تھے اور ایڈیٹر بھی، شروع شروع میں اسی بازار میں رہتے تھے۔ وہ طبیب بھی ہیں ادیب بھی ہیں اور خاکسار بھی۔ ہر اسلامی تحریک میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے اور اردو زبان کو مقبول عام بنانے میں انہوں نے اپنے رسالے کی قیمت اتنی کم کردی کہ اپنا سارا اثاثہ اس پر لٹا بیٹھے۔ بارود خانے کا علاقہ جن مایہ ناز ادیبوں کی سکونت کی بدولت دنیائے ادب میں شہرت رکھتا ہے ان میں یوسف حسن کا مرتبہ کسی سے کم نہیں۔

بارود خانے سے آگے جائیں تو قلعے کے عقب میں ایک میدان آتا ہے جو گھاٹی کے نام سے مشہور ہے یہ کسی زمانے میں مغل فوجوں کی خیمہ گاہ تھی۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت یہ ایک بے آب و گیاہ ڈھلوان تھی اس سے ذرا آگے چلیں تو ایک بازار آتا ہے جسے موتی بازار کہتے ہیں یہ چوک سر جن سنگھ سے شروع ہو کر مستی دروازے تک چلا جاتا ہے۔ اس میں ایک

بہت مشہور طبیب اور نیک سیرت انسان حکیم سید بزرگ شاہ رہتے تھے جو لاہور کے سادات کے ایک معزز خاندان کے رکن تھے۔ خدا نے انہیں دستِ شفا بخشا تھا اور ان کی دعا ایسی مستجاب تھی کہ لوگ دور دور سے آتے اور نسخوں کے ساتھ ساتھ اُن کے تعویذ بھی لے جاتے۔

طبیبوں کا خاندان

پرانے زمانے ہی سے لاہور کے دو چار خاندانوں میں طبابت کا پیشہ موروثی تھا ایک تو بازار حکیماں میں ہمارا خاندان تھا کہ اس کا ہر رکن طبابت کے فن میں ماہر تھا اور حکیم کہلاتا تھا۔ میں بھی اسی نسبت سے حکیم کہلاتا ہوں دوسرا موتی بازار میں انہی حکیم سید بزرگ شاہ کا خاندان۔ ان کے صاحبزادے بھی بیرسٹر ہونے کے باوجود حکیم سید عباس علی ہی کہلاتے تھے۔ تیسرا شاہ عالمی دروازے کے اندر حکیم عالم شاہ کا خاندان جو ان کی ذات والا صفات کے باعث بہت مشہور ہوا۔ چوتھا موچی دروازے کے اندر تیلیوں والے رڑے میں حکیم سید مراتب علی اور حکیم سید نوازش علی کا خاندان۔ حکیم سید نوازش علی نے سو برس کے قریب عمر پائی اور ابھی دو چار برس ہی گزرے ہیں کہ ان کا انتقال ہوا۔ اور پانچواں چونے منڈی میں حکیم سید بہادر شاہ کا خاندان۔ یہ شیخوپورہ کے راجہ دھیان سنگھ کے ذاتی طبیب تھے۔

اگرچہ سکھوں کے زمانے میں لاہور میں لالہ حاکم رائے اور بھائی وسطی رام جیسے مشہور ہندو اطباء فنِ طبابت میں یکتائے روزگار مانے جاتے تھے مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں ہندو زیادہ تر مغربی طریقۂ علاج کی طرف مائل ہو چکے تھے اور مغربی طب میں دو تین مسلمان ڈاکٹروں کے سوا جس طرف بھی دیکھیے ہندو ڈاکٹر ہی نظر آتے تھے۔

موتی بازار میں حکیم سید بزرگ شاہ کے مکان سے ذرا آگے چل کر ایک گلی آتی ہے جس میں لاہور کے دو مشہور پہلوان جنھوں نے ملک بھر میں بڑے بڑے میدان مارے تھے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام رستم ہند بوٹا پہلوان تھا اور دوسرے کا نام کریم بخش پیلڑے والا چونکہ میں بھاٹی دروازے اور مستی دروازے کے درمیانی علاقے کے نامور لوگوں کا ذکر کر رہا ہوں اس لیے ایسے لوگوں کا تذکرہ بھی بے محل نہیں جن کی شہرت محض اکتسابِ علم ہی پر مبنی نہ تھی یا جن کا حلقہ اثر درس و تدریس ہی تک محدود نہ تھا۔

ان دونوں پہلوانوں نے اپنے زمانے میں بڑا نام پایا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر لاہور امرتسر کے پہلوانوں کے جسمانی کمالات کا درجہ پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کے علمی اور ادبی اکتسابات کے درجے سے کم نہیں تو ان پہلوانوں کے اکھاڑے بھی بڑی بڑی تعلیمی درسگاہوں سے کم اہمیت نہیں رکھتے تھے امرتسر کے غلام پہلوان اور کلو پہلوان اور لاہور کے گاماں پہلوان امام بخش پہلوان کے کمال فن کی شہرت اپنے ملک کی حدود ہی تک محدود نہیں بلکہ ممالک شرق و غرب بھی ان کی نشہ زوری کا اور داؤ پیچ کا لوہا مان چکے ہیں۔

اسی گلی کے اندر ایک مسجد ہے جس کے امام اور خطیب حافظ خیر محمد ایک بڑے باخدا بزرگ تھے ان کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ اسلام کی حقیقی سیرت سے آشنا تھے۔ دن بھر کتابوں کی جلد بندی کرتے اور اس کی مزدوری پر گزران کرتے۔ لیکن مسجد میں پانچوں وقت باقاعدہ نماز پڑھاتے اور صبح و شام درس قرآن دیتے۔ انہیں طبابت میں بھی بہرہ وافر حاصل تھا۔ اور لوگ ان کے تعویذوں پر بھی بڑا اعتقاد رکھتے تھے۔ اس قسم کے بزرگوں کا اب قحط الرجال ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے میرا تو اس بات پر یقین ہے کہ جس دینی یا دنیاوی خدمت کا مال و مقصد کسب زر ہو یا نمائش و شہرت ہو وہ نہ تو وسیلۂ عزت ہوتی نہ باعث برکت۔

اسی بازار میں آگے چل کر مستی دروازے قریب ایک مسجد ہے جسے بیگم شاہی مسجد کہتے ہیں اس کے امام اور خطیب مولانا غلام قادر تھے حسب و نسب کے لحاظ سے یہ افغان تھے اور چمکنی کے صاحب فیض پیر صاحب کے مرید۔ عربی اور فارسی کے علوم میں ان کو وہ دست گاہ حاصل تھی کہ بڑے بڑے عالم و فاضل ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے تھے۔ میرے والد جو اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے میں دہلی میں قاضی القضاۃ ہند، صدر الصدور مفتی صدرالدین سے اکتساب علم کر چکے تھے۔ عربی زبان کے فاضل اجل ہونے کے باوجود اپنی عربی اور فارسی زبان کی تصنیفات مولانا غلام قادر ہی کو دکھاتے اور ان سے اصلاح لیتے تھے۔

مجھے بھی اپنے بچپن میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ اور میں نے اکثر دیکھا کہ وہ درس دیتے وقت بھنے ہوئے چنے اور منقٰی چباتے رہتے تھے بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اسی پر ان کی خوراک کا دار و مدار ہے۔ ہاں میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے درس و تدریس کا سلسلہ انہیں لوگوں تک محدود ہے جو علم و فضل میں منتہائے کمال کو پہنچ چکے تھے بچوں کو درس قرآن دینے کے لیے ان کے ایک شاگرد اور مرید تھے جو قاضی جی کہلاتے تھے۔

اس فقیر گوشہ نشین کو میں نے اس زمانے میں دیکھا۔ جب مجھ میں ان کے علم و فضل کو پرکھنے کی استعداد نہ تھی۔ میں تو ان کی خدمت میں محض اکتساب سعادت و شرف کے لیے حاضر ہوتا تھا اور وہ اس لیے کہ میری بسم اللہ کی رسم اس مرد حق آگاہ کی

زبان سے ادا ہوتی تھی۔ نام ونمود سے ان کو نفرت تھی۔ اور اپنے کام سے کام۔ میں نے جب کبھی انہیں دیکھا مسجد کے محراب کے قریب ایک مصلے پر بیٹھے دیکھا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ہمارے گھر میں ان کا نام بہت احترام سے لیا جاتا تھا۔

مردِ مؤمن کی خوراک

اس مضمون میں بعض بزرگوں کے علم فضل کا تذکرہ محض اشارۃً کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے کمالات کا بیان کسی قدر تفصیل چاہتا ہے۔ یہ تفصیل اگر اختصار کے ساتھ بیان کر دی جائے تو بہتر ہے۔ اس سے ان بزرگوں کی یاد بھی تازہ ہو جائے گی اور اس مضمون کی تاریخی حیثیت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

مولانا فیض الحسن سہارنپور کے رہنے والے تھے اور قاضی القضاۃ ہند صدر الصدور مفتی صدرالدین آزردہ کے شاگرد اپنی تعلیم کے زمانے میں انہیں مولانا امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، میرزا اسداللہ خاں غالب اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کی صحبت کا بھی شرف حاصل رہا۔ ابتدا میں اپنا کلام مولانا امام بخش صہبائی کو دکھاتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ دہلی کے دوران دلی سے نکل کر اپنے وطن مالوف سہارنپور چلے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ جا کر عربی کی چند کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۷۰ء میں لاہور آگئے۔ ڈاکٹر لائنٹر ان کے علم وفضل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں اس سال اورینٹل کالج میں شعبہ عربی کا صدر مقرر کر دیا۔

امامُ الادبؒ

لاہور میں ان کا قیام بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں رہا۔ ۱۸۷۱ء میں انہوں نے اسلام کی سیاسی اور علمی تاریخ پر دو جلدوں میں "سنینِ اسلام" کے نام سے ایک بڑی مفید تالیف شائع کی۔ ان کی تصنیفات سے ان کے علم وفضل کی وسعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ "حیاتِ شبلی" میں سید سلیمان ندوی کا یہ قول مولانا فیض الحسن کے علم وفضل کی عظمت پر شاہد ہے "مولانا فیض الحسن اس پائے کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو۔"

میرے والد حکیم شجاع الدین شاعری میں انہیں کے شاگرد تھے۔ مولانا فیض الحسن کا ہر شعر ان کے جوہر کمال کا آئینہ دار ہے۔ میں نے حضرت اقبال کو بھی اکثر اُن کے اشعار کو پڑھتے اور ان کی تعریف کرتے سنا ہے۔ مولانا فیض الحسن نے سترہ برس تک اورینٹل کالج لاہور کے طلبا۔ کو اپنی شاگردی کی سعادت سے فیض یاب کرنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں انتقال فرمایا۔

مجھے ان کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا وہ میری پیدائش سے پہلے ہی رحلت فرما چکے تھے۔ ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے بزرگوں کی زبانی سنا ہے اور وہ اس لیے لکھا ہے کہ بھاٹی دروازے میں رہنے والے صاحبانِ علم و فضل میں ان کا نام سرفہرست ہے اور اگر یہ مضمون ان کے ذکر سے خالی رہ جاتا تو گویا ایک بڑی سعادت سے محروم رہ جاتا۔

شمس العلما مولانا عبدالحکیم کلانوری اورینٹل کالج لاہور میں ۱۸۷۲ء سے ۱۹۱۶ء تک صدر مدرس فارسی کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے وہ بہت وجیہ انسان تھے اور ان کی گفتگو کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی اچھی طرح سوچ سمجھ کر بات کر رہا ہو۔ شام کے وقت اکثر میرے بھائی حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آ بیٹھتے تھے۔ جب وہ آتے تو حضرت اقبال زیادہ تر انہیں سے مخاطب ہوتے اور شعر و شاعری کے ادبی محاسن پر گفتگو کرتے۔

حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں بیٹھنے والے وکیل، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی سے اسلامی قانون میں رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

انہوں نے قواعد فارسی کے علاوہ عروض، صنائع بدائع اور املا کے خصائص پر کئی رسالے لکھے ہیں جن سے فارسی ادب کے طلبا کو اکتساب علم میں بڑی مدد ملی ہے ان کے مکان پر ان کے شاگردوں کا جمگھٹا رہتا تھا اور جب بازار میں چلتے تھے تو اس وقت بھی ان کے شاگرد اُن کے ساتھ ساتھ چلتے اور شعر و سخن کی گتھیاں سلجھانے میں ان کی رہنمائی کے طالب نظر آتے۔ سر پر بہت بڑا عمامہ ہوتا اور بدن پر ایک ڈھیلا ڈھالا جُبّہ۔ ہاتھ میں عصا کی وضع کی لکڑی رکھتے تھے۔ آخر کار اورینٹل کالج میں چوالیس برس تک استادی کے فرائض انجام دینے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ اردو، فارسی اور عربی میں ان کی کئی تصنیفات مشہور ہیں۔

شمس العلما مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، ۱۸۸۳ء میں اورینٹل کالج میں عربی کے مدرس مقرر ہوئے اور ۱۸۸۷ء میں مولانا فیض الحسن کے انتقال کے بعد عربی کے صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے یہ ہمارے مکان کے دیوار بہ دیوار رہتے تھے ان کے صاحبزادے مفتی انوار الحق اور میرا بچپن ساتھ ساتھ گذرا ہے۔ مفتی انوار الحق بھوپال میں ایک مدت تک ناظم تعلیمات رہے۔

مفتی محمد عبداللہ ٹونکی

مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، فقہ اسلامی کے بہت بڑے عالم تھے۔ اسلامی قانون اور شرعی تنازعات میں ان کا فتویٰ ناقابل تردید سند متصور ہوتا تھا۔ وہ بہت کم بولتے تھے۔ لیکن جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا برہان قاطع کا حکم رکھتا تھا۔ یہ بھی ہر شام حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آ بیٹھتے تھے اس مجلس میں بیٹھنے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا پیشہ وکالت تھا۔ اور کچھ ایسے بھی جن کو قرآنی احکام کی حکمتوں کو سمجھنے کا شوق تھا۔ اس باب میں مفتی محمد عبداللہ ٹونکی کی رہنمائی ان لوگوں کے بڑے کام آئی۔

مفتی محمد عبداللہ بہت دبلے پتلے انسان تھے۔ پان ہر وقت چباتے رہتے تھے اور جب بات کرتے تو منہ پر رومال رکھ کر بات کرتے تھے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس ناتواں جسم میں علم و فضل کا اتنا ذخیرہ ہے کہ کوزے میں دریا بند ہونے کی مثل ان پر صادق آتی ہے۔ ۳۴ سال تک اورینٹل کالج میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو ہوگئے۔ اور لاہور کو جسے وہ اپنا دوسرا وطن کہا کرتے تھے۔ داغ مفارقت دے گئے۔

شرع محمدی میں چار جلدوں میں ان کی کتاب اردو زبان کا ایک قابل قدر سرمایہ ہے۔ کئی مسائل پہ ان کے فتاویٰ رسالوں کی صورت میں شائع ہوئے اور تشنگان رموز و نکات شرع اسلامیہ نے ان سے بڑا فیض پایا۔ لاہور سے جا کر کچھ عرصہ تک دار العلوم ندوہ میں کام کیا اور اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے، ۱۹۲۰ء میں رحلت فرمائی۔ ان کی وفات سے عربی زبان ایک فاضل اجل اور اسلامی شریعت ایک بے نظیر نکتہ داں کی ذات سے محروم ہوگئی۔ سید سلیمان ندوی کے قول کے مطابق "وفات کے وقت مفتی محمد عبداللہ کی عمر کوئی ستر برس کے قریب تھی"۔

اسے بھاٹی دروازے کی خوش قسمتی سمجھئے کہ جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دہلی اجڑی تو دہلی کے سب سے پرانے اخبار کے مالک اور ایڈیٹر مولوی محمد باقر کے بیٹے مولوی محمد حسین آزاد نے انقلابات زمانہ کے گوناگوں مصائب سے تنگ آ کر اپنے وطن مالوف سے ہجرت کی اور آخر کار لاہور آ کر بھاٹی دروازے کے اندر تحصیل بازار میں گوشہ نشیں ہوگئے۔ ان کے علم و فضل کا جوہر ایسا نہ تھا کہ چھپائے چھپتا، سر رشتہ تعلیم پنجاب نے لاہور میں ان کی آمد کو غنیمت جانا اور انہیں رشتہ ملازمت میں منسلک کر کے جہاں ان کے جوہر کمال کی قدر دانی کی، وہاں ان کے لیے ایسے مواقع بھی بہم پہنچائے کہ ان کی شہرت کا آفتاب جسے

گردشِ تقدیر سے گہن لگ چکا تھا۔ افقِ علم و ادب پر بڑی درخشانی سے چمکنے لگا۔

محکمہ تعلیم میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۸۷ء میں اورینٹل کالج میں شعبہ عربی کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ اور اس سال انہوں نے شمس العلما کا خطاب بھی پایا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے ادبی کارنامے محتاجِ تعارف نہیں پنجاب میں اردو زبان کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے باب میں جو سنہری کارنامے اُن کی ذات سے منسوب ہیں وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ آبِ حیات، نیرنگِ خیال، قصص الہند اور دربارِ اکبری جیسی مستند تصانیف ان کے علم کی وسعت اور دنیائے ادب میں ان کے مرتبے کی عظمت کی شاہد ہیں۔

مولانا آزاد کے اِحسانات

لیکن سب سے بڑا احسان جو انہوں نے اُردو زبان کے طلبا پر کیا ہے یہ ہے کہ انہوں نے کرنل ہالرائڈ کے ایما پر جو اس زمانے میں سررشتہ تعلیم کے ناظم الامور تھے۔ اُردو نصاب کی کتابیں لکھیں۔ یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کے لکھے ہوئے نصاب کے بعد اس سلسلہ میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ انہیں کی دکھائی ہوئی راہ کی پیروی تھی۔ مگر کسی سے وہ بات بن نہ آئی، جس کی طرح وہ ڈال چکے ہیں۔

ایک اور احسان جو انہوں نے اُردو شاعری پر کیا وہ یہ تھا کہ اسے غزل کی پرانی ڈگر سے ہٹایا اور اس کی انگلی پکڑ کر اسے نیچرل شاعری کی نئی راہوں پر چلانے لگے۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے اب "خالِ رخِ یار" "گیسوئے خم در خم" اور "حسن و عشق" اور "ہجر و وصال" کے خیالی صنم کدے نہ رہے بلکہ مظاہرِ فطرت کے وہ عجائب خانے بن گئے جن کے نوادر کو دیکھ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ایک بے مثال ادیب اور ایک عدیم النظیر شاعر کی حیثیت سے مولانا محمد حسین آزاد کے کمالات کو ان چند سطور میں محدود کرنا ایک گستاخی ہے جس کا ارتکاب محض اس لیے قابلِ عفو ہے کہ اس مضمون کی حدود میں ان کی غیر محدود صلاحیتوں کا

بیان نہیں سما سکتا ۔ مجھے ان کی زیارت کا شرف اکثر حاصل ہوا اور اس زمانے میں جب انہیں دانش فروشان ریاپرست ہوش وحواس سے بیگانہ سمجھتے تھے میں نے انہیں بڑے بڑے داناؤں سے زیادہ دانا پایا۔ آخری زمانے میں وہ بھاٹی دروازے سے اُٹھ کر اکبری دروازے کے اندر نواب صاحب کی حویلی کے عقب میں اپنے صاحبزادے آغا محمد ابراہیم کے مکان میں چلے آئے اور وہیں ۱۹۱۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سر عبدُالقادر

شیخ سر عبدالقادر جو شروع شروع میں بھاٹی دروازے کے اندر موتی ٹبے میں رہتے تھے اپنے علمی اور ادبی کارناموں کے علاوہ ان اعزازات کے باعث جو انہیں سرکار دربار میں حاصل ہوئے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یہ چند سطور محض ان کی عظمت کے اعتراف اور ان کے کمال کی عظیم تفصیل کے اجمال کے طور پر لکھی جا رہی ہیں۔

وہ ۱۸۷۴ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرکے ۱۸۹۵ء میں وہ مسلمانوں کے پہلے انگریزی اخبار "پنجاب آبزرور" کے مدیر مقرر ہوئے۔ انگریزی زبان میں ان کی قابلیت کی یہ پہلی سند تھی جو انہیں بن مانگے ملی۔ ۱۸۹۶ء میں جب سر سید احمد خاں نے لاہور میں ایم اے۔ او کالج علی گڑھ کو پنجاب میں متعارف کرنے کے سلسلے میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی اور اس میں کالج کے پرنسپل سر تھیوڈور بیک نے انگریزی میں تقریر کی تو شیخ عبدالقادر نے ان کی تقریر کے ختم ہوتے ہی اس کا ترجمہ ایسی شستہ اردو میں کیا کہ اور لوگ تو کیا خود سر سید احمد خاں بھی حیران ہو گئے۔ اس دن سے وہ انہیں مولوی عبدالقادر کہنے لگے۔ اردو زبان کی ترویج کی دھن اب ان کے دل میں ایسی سمائی کہ وہ روز و شب اس کوشش میں مصروف رہے کہ پنجاب کو اُردو زبان کا مرکز بنا دیں اور علم و ادب کی جو بساط دلی اور لکھنؤ میں اُلٹ چکی تھی اسے ایک نیا رنگ و رُوپ دے کر لاہور میں سجا دیں۔

وہ اسی بازار حکیماں میں فقیر جمال الدین کی حویلی کے سامنے میاں حسین بخش کے مکان میں رہتے تھے اور یہیں سے ۱۹۰۱ء میں رسالہ "مخزن" جاری ہوا۔ اس رسالے کے سرورق پر ہندوستان کا ایک نقشہ ہوتا تھا جس میں تین مختلف نشانوں سے ان مقامات کی نشاندہی منظور تھی جن میں یا تو اُردو بولی جاتی ہے یا اُردو سمجھی جاتی ہے اور یا جن کے رہنے والوں کی مادری زبان

اُردو ہے۔ یہ رسالہ بہت مقبول ہوا اور اس نے اپنے بے جان اوراق میں نئے نئے ادیبوں اور شاعروں کے رشحات فکر و قلم سے زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی اور شائقین ادب کے دل میں اس دور کی یاد تازہ ہوگئی۔ جب سرسید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد نواب محسن الملک سید احمد خاں دہلوی، مولانا شبلی، مولانا حالی، مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور ان کے دوسرے نامور معاصر ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دہلی کے بعد گیسوئے اُردو کی مشاطگی میں سرگرم رہے تھے۔ مخزن نے ایک ایسی محفل سجائی کہ اس میں اس زمانے کے تمام ممتاز ادیب مل بیٹھے۔ سر محمد اقبال، چودھری خوشی محمد ناظر، مرزا اعجاز حسین، میر غلام بھیک نیرنگ، عبدالرشید چشتی، مولوی ظفر علی خان، شیخ محمد اکرام اور تلوک چند محروم اس محفل کے مستقل رکن تھے۔ یہ محفل کوئی محفل مشاعرہ نہ تھی، بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک نئے رنگ کی محفل تھی۔ اس میں شعر و شاعری کے علاوہ نثر کی سحر طرازیاں بھی اپنے پورے جوبن پر نظر آتی تھیں۔ اس محفل میں مخزن کا رسالہ ترتیب پاتا اور جو کچھ اس محفل میں پڑھا جاتا ہر مہینے مخزن میں شائع ہو کر تشنگان ادب کی پیاس بجھاتا جب تک شیخ عبدالقادر لاہور میں رہے اس محفل کا رنگ جما رہا۔

ہزار داستان

اسی قسم کی ایک دوسری محفل ادب اس وقت گرم ہوئی جب میں نے ۱۹۱۹ء میں "ہزار داستان" کا رسالہ شائع کیا احمد شاہ بخاری پطرس، سید عابد علی عابد، سید امتیاز علی تاج، مسٹر ہادی حسن، مولانا سہا، میر صولت، حامد حسین خاں بیدل، عبدالمجید سالک، پنڈت سدرشن اور اختر شیرانی اس فدائے ادب کے روشن ستارے تھے۔ عبدالرحمٰن چغتائی کے موئے قلم کی سحر نگاری سے ہزار داستان کا ہر شمارہ دیدہ وروں کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور ہوتا تھا۔

مخزن ہی کی طرح ہزار داستان بھی ان نامور ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں ترتیب پاتا اور شعر و ادب کی وہ بساط بچھاتا جو کسی زمانے میں شیخ عبدالقادر نے بچھائی تھی۔ ہزار داستان کا ذکر اس جگہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ اس کی اشاعت کی ابتدا بازار حکیماں میں میرے مکان ہی سے ہوئی اور یہ ستارہ بھی اس اُفق پر روشن ہوا جو بھاٹی دروازہ ہے کی زمین سے آملتا ہے۔ ہزار داستان کو دو ایسی سعادتیں نصیب ہوئیں جن کا ذکر میرے تخیل کی مسرتوں کا معراج اور گذرے ہوئے زمانے کی یاد کا سرور و کیف ہے۔

"ہزار داستان" کا سرورق حکیم فقیر محمد جیسے نامور خطاط نے لکھا اور سر محمد اقبال نے نہ صرف اس رسالے کا نام ہی تجویز کیا بلکہ اپنے قلم سے اس کے سرورق پر مجھے مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر تحریر فرمایا۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا!
بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے

اب یہ شاعرِ مشرق کی فطرتِ روشن ہی پر آشکار ہوگا کہ انہوں نے میرے عشق کے داغِ ناتمام میں کیا سوز و ساز دیکھا اور وہ حاصلِ سوز و ساز کیا تھا جس سے وہ چاہتے تھے کہ اس زمانے کی بزمِ ادب میں اُجالا ہو جائے۔

شیخ عبدالقادر ۱۹۰۴ء میں انگلستان چلے گئے اور بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ۱۹۰۶ء میں واپس آئے۔ اقبال بھی اسی زمانے میں انگلستان میں تھے میں نے ان بزرگوں کی زبان سے سنا ہے کہ قیامِ انگلستان میں انہیں ہمیشہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے امکانات پر غور و فکر کرتے میں مصروف دیکھا۔ اقبال کے دل پر شیخ عبدالقادر کی شخصیت کے تاثرات اس خط سے ظاہر ہیں جو انہوں نے ان کے نام ایک نظم کی صورت میں لکھا۔ اور ان الفاظ میں انہیں دعوتِ عملی دی۔

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر — قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بے کار — قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیِ مغرب میں جو داغ — چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں — خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

آگے چل کر ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل کی تنظیم میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ان تصورات کے آئینہ دار ہیں جن کی جھلک اس نظم کے اشعار میں نظر آتی ہے، جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں۔

سرکاری عہدے

شیخ عبدالقادر اپنی زندگی میں بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ ہائیکورٹ کے جج مقرر

ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں مجلس قانون ساز پنجاب کے صدر بنے۔ ۱۹۲۵ء میں حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم مقرر ہو کر جنیوا گئے ۱۹۲۸ء میں پنجاب ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنے اور سر کا خطاب پایا۔ ۱۹۲۹ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن مقرر ہوئے ۱۹۳۰ء میں دوبارہ لاہور ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے ۱۹۳۴ء میں انڈیا کونسل لنڈن کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں والسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنے اور پھر سرکار برطانیہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ۱۹۴۲ء میں بہاولپور ہائی کورٹ کے چیف جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں اس ملازمت سے سبکدوش ہو کر لاہور میں مقیم ہو گئے۔

زبان اُردو کی ترویج میں جو انہماک سر عبدالقادر کو تھا وہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ۱۹۴۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ایم اے (اُردو) کی جماعتوں کا سلسلہ شروع کیا تو انہوں نے اورینٹل کالج میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے ایم اے (اُردو) کی جماعت کو پڑھانا شروع کر دیا اور اس طرح کشت زار اُردو کو ابر کرم سے سیراب کیا۔

اس زمانے میں انہوں نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود درس و تدریس کے باب میں وہ سرگرمی دکھائی کہ جواں سال اساتذہ کے لیے ایک مثال بن گئے۔ ۹۔فروری ۱۹۵۰ء کو ایک معروف اور کامیاب زندگی کے شب و روز گذار کر سر عبدالقادر نے رحلت فرمائی میں اپنے تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ جو جگہ انہوں نے خالی چھوڑی وہ پھر کبھی پُر نہ ہوئی۔

چوہدری شہاب الدّین

سر شہاب الدین بھی بھاٹی دروازے ہی کے اندر سمیوں کے محلے میں رہتے تھے۔ وہ پنجاب کے ان نامور اور فقید المثال لوگوں میں سے ہیں جو ایک پسماندہ علاقے میں ہوش سنبھالنے کے باوجود کامیابی اور ترقی کے ان مدارج اعلیٰ تک پہنچے جہاں پہنچنا ہر انسان کے بس میں نہیں۔ ایک نہایت ہی باعمل زندگی اور شب و روز کی محنت و مشقت کے جتنے انعامات ہو سکتے ہیں انہوں نے حاصل کیے۔ ۱۹۰۰ء میں بی اے کا امتحان پاس کر کے پولیس کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ پھر اس ملازمت سے دستبردار ہو کر کچھ دنوں تک اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں "پنجاب کریمینل لا جرنل" ایک قانونی رسالہ شائع کرنا شروع کیا۔

اس رسالے کی کامیابی سے حوصلہ پاکر "انڈین سٹیچوٹس اینڈ کیسز" INDIAN STATUTES AND CASES کا ایک ہمہ گیر قانونی مجموعہ مرتب کرنے لگے لاہور کی شہری اور پنجاب کی سیاسی زندگی میں عمر بھر ایک نمایاں حصہ لیتے رہے ایک مدت تک لاہور کارپوریشن کے ممبر رہے اور بائیس برس تک پنجاب کی مجلس قانون ساز کی صدارت پر فائز رہے۔

سر شہاب الدین پنجابی زبان کے بڑے حامی اور بڑے مشہور شاعر تھے۔ مسدس حالی کا پنجابی زبان میں ایسا ترجمہ کیا کہ وہ ترجمہ ان کی اپنی ہی تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے مجلس قانون ساز پنجاب کی صدارت کے فرائض ایسی خوبی سے انجام دیئے کہ پھر اُن جیسا صدر اس مجلس کو کبھی میسر نہ آیا۔ یہ بھی ہر شام کو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے۔

بے تکلّفانہ مراسم

اقبال اور ان کے بے تکلّفانہ مراسم پر بے شمار لطائف شاہد ہیں جن کے بیان کی اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ اپنی محنت اور مشقت سے بہت دولت کمائی اور اس دولت کا بیشتر حصہ یا تو خدا کی راہ میں صرف کیا اور یا اپنے دور و نزدیک کے رشتہ داروں کو دیا۔ نادر اور بیش قیمت کتابیں جمع کرنے کے شوق نے اُن کی ذاتی لائبریری کو ایک بے نظیر کتب خانہ بنا دیا تھا۔ یہ کتب خانہ ان کی وصیت کے مطابق اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ایک بے بہا سرمایہ ہے۔

اسی وصیت کے مطابق وفات سے پہلے ہی اپنی وہ قیمتی زمین جو شاہدرہ ریلوے سٹیشن کے سامنے واقع ہے۔ انجمن حمایت اسلام کو دے گئے۔ عمر بھر ان کا دولت کدہ سیاسی تحریکوں کا اکھاڑہ بنا رہا جس میں ہر سیاست فروش نے زور آزمائی کی۔ سر شہاب الدین نے کبھی اس پہلوان کی پیٹھ ٹھونکی کبھی اس پہلوان کو پٹخنی دی۔ سیاست کے فن میں ایسے ماہر تھے کہ ہمیشہ انہی کی رہتی تھی۔

قوّتِ حافظہ

بڑے بلند قامت اور رعب داب والے انسان تھے۔ آواز میں ایسا جلال تھا کہ جب ٹیلیفون پر بات کرتے تو ٹیلیفون

کے تار رعشہ براندام ہو جاتے۔ مجلس قانون ساز میں ان کی آواز کسی مائیکروفون کی محتاج نہ تھی۔ قوت حافظہ کا یہ حال تھا کہ پارلیمنٹری پریکٹس کی کتابوں کے صفحوں کے صفحے ازبر تھے۔ ان کی قانون دانی سے مجلس قانون ساز کا ہر رکن مرعوب رہتا تھا۔ اور ان کی نکتہ وری کا لوہا سبھی مانتے تھے۔

میں نے اپنے بچپن سے ان کے دم واپسیں تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور سچ بات تو یہ ہے کہ اس رفاقت سے بڑا فیض پایا۔ اس سرچشمہ فیض کی اتنی خوبیاں مجھے یاد ہیں کہ ان کے بیان کے لیے اس مختصر مضمون میں نہ گنجائش ہے نہ وسعت بس یہی کہہ دینا کافی ہے کہ سر شہاب الدین بجائے خود ایک محفل تھے اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ محفل بھی سونی ہو گئی۔

مولوی احمد دین

مولوی احمد دین وکیل جن کا نام ان لوگوں میں آیا ہے جو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں ہر شام کو جمع ہوتے تھے اپنے زمانے میں دیوانی قانون کے ماہر تھے اور بڑے پائے کے ادیب۔ الفاظ کی تاریخ میں انہوں نے "سرگذشت الفاظ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو اس مضمون پر ایک لاثانی کتاب ہے اور اپنے مصنف کی عرق ریزی اور ژرف نگاہی پر شاہد۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ جو اب شاید کسی کی یاد میں محفوظ نہیں یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اقبال کو ان کے اصلی روپ میں دیکھا اور ان کی شاعری کو اس کے اصلی رنگ میں سمجھا اور اقبال کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی اور اس میں اقبال کے وہ تمام اشعار جمع کیے جو بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح ابھی کسی لڑی میں نہ پروئے گئے تھے اور پھر ان اشعار کی اس طرز پر تشریح کی جس طرز پر "مائینڈ اینڈ آرٹ آف شیکسپیئر" لکھی گئی تھی۔

یہ کتاب لاہور کے ایک نامور ناشر شیخ مبارک علی نے چھاپی۔ لیکن ابھی یہ کتاب شائع نہ ہوئی تھی کہ اقبال کو اپنے کلام کے مجموعے کو شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا اور یہی وہ مجموعہ ہے جس نے بعد میں "بانگ درا" کی شکل اختیار کی۔ مولوی احمد دین نے اس خیال سے کہ ان کی کتاب کی اشاعت سے "بانگ درا" کی اشاعت کو نقصان پہنچے گا اپنی کتاب خود ہی تلف کر دی۔

اور اس طرح دنیائے ادب ایک بڑی مفید تحقیقی یادداشت سے محروم ہوگئی۔ مولوی احمد دین کی تحریر کا اسلوب اپنے استاد مولانا محمد حسین آزاد کا ہو بہو خاکہ تھا اور بڑے بڑے نقادانِ ادب کو بھی شاگرد کی تحریر میں استاد ہی کی تحریر کا عکس نظر آتا تھا۔

مولوی احمد دین بھی تحصیل بازار میں "وان والی گلی" میں رہتے تھے۔ ان کے مکان سے ملحق مولوی تاج الدین کا مکان تھا جو ان مسلمان گریجوایٹوں میں سے تھے جنہوں نے انگریزی زبان میں بے مثال مہارت پیدا کرنے میں بڑا نام پایا۔ یہ بھی پہلے سررشتۂ تعلیم پنجاب میں ملازم ہوئے اور بعد میں ریاست پٹیالہ کے محکمہ تعلیم میں ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ بڑے متین اور صاحب الرائے بزرگ تھے۔ شیخ عبدالقادر، مولوی احمد دین اور مولوی تاج دین پرانی وضع کے اس قدر پابند تھے کہ میں نے انہیں ان کی جوان سالی کے زمانے میں بھی کبھی بے ریش نہیں دیکھا۔

خواجہ برادران

وان گلی سے آگے چل کر اسی تحصیل بازار میں ایک اور کوچہ ہے جسے بھاڑوں کی تھڑیاں کہتے ہیں۔ خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش اور خواجہ امیر بخش تینوں بھائی اسی کوچے میں رہتے تھے۔ یہ بزرگ اپنے عزلت گزینی کے باعث منظرِ عام پر نہیں آئے۔ مگر وہ اس محفل کے روح و رواں تھے جو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں ہر شام کو جمتی تھی۔ ان کی جرأت تنقید اور جوہر شناسی نے اس زمانے کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔

جب تک سر محمد اقبال اپنا کلام ان بزرگوں کو نہ سنا لیتے اسے کسی مجلسِ عام میں نہ پڑھتے تھے۔ "نالہ یتیم"، "ہلالِ عید"، "تصویرِ درد"، "شمع و شاعر" کی سی مشہور و معروف نظمیں اقبال نے پہلے انہی لوگوں کے سامنے پڑھیں اور پھر ان سے دادِ سخن پا کر انہیں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھ کر جہانِ اسلام سے خراجِ تحسین و عقیدت وصول کیا۔

جامعُ اللُّغات

خواجہ فیروزالدین بیرسٹرایٹ لا جو ڈاکٹر اقبال کے ہم زلف تھے اور جنہوں نے آگے چل کر ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے بڑا نام پایا انہی خواجہ رحیم بخش کے بیٹے ہیں اور خواجہ عبدالمجید جاؒمع اللغات" جیسی جامع اور ضخیم لغت کے مصنف خواجہ کریم بخش کے صاحبزادے ہیں۔ اس لغت کی گیرائی اور اس کے مؤلف کی وسعتِ نظر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ رموزِ ادب کا دلدادہ اپنی سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود عمر بھر کِس انہماک سے اس عظیم الشان تالیف کی تکمیل کے درپے رہا جو آج اُردو ادب کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فیض اسی گھرانے کا ہے جس کے جوار عاطفت میں ان دونوں نوجوانوں نے پرورش پائی۔

اس بازار میں اس کوچے کے سامنے ایک طرف پنڈت رگھبیر دیال جوتشی اور دوسری طرف ڈاکٹر ہیرالال رہتے تھے۔ جیوتش کے علم کے متعلق لوگوں کے مختلف نظریات ہیں۔ لیکن ان سب نظریات سے قطع نظر میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پنڈت رگھبیر دیال اس علم میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ سر شہاب الدین ہی کیا بڑے بڑے لوگ دُور دُور سے آتے اور ان سے زائچے بنواتے۔ بڑے نیک دل اور خدا پرست انسان تھے۔

میں بھی ان کی خدمت میں کئی مرتبہ حاضر ہوا اور ان سے جیوتش کے رموز سیکھنے کی کوشش کی، لیکن میں نے دیکھا کہ سنسکرت کے علم سے بہرہ وافر کے حصول کے بغیر اس بحرِ بے پایاں کی شناوری بہت مشکل ہے۔ ان کے مکان کے سامنے ہر قسم کے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور ہر شخص ستاروں کی گردش کے اس راز دار کی زبانی اپنے مستقبل کے ان اسرار کا جویا نظر آتا تھا۔ جو پردہ غیب میں مستور ہوتے ہیں۔ بہرحال پنڈت رگھبیر دیال کا مکان کوئی نصف صدی تک مرجع خاص و عام رہا۔

ڈاکٹر ہیرالال اپنے زمانے کے بڑے مشہور سرجن تھے۔ بہت ہنس مکھ، بڑے ملنسار اور اپنے فن میں ماہر، غریب ہو یا امیر۔ ہر مریض کو بڑی احتیاط سے دیکھتے اور اپنے ہر مریض کا علاج بڑی توجہ سے کرتے۔ اس زمانے میں انگریزی طریقۂ علاج کا ابھی چرچا نہ تھا، تاہم ڈاکٹر بیلی رام، ڈاکٹر ہیرالال، ڈاکٹر نہال چند، ڈاکٹر محمد حسین اور ڈاکٹر رحیم خان انگریزی طریقۂ علاج میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔

ڈاکٹر ہیرا لال کے مکان کے سامنے ڈاکٹر دولت رام کا مطب تھا۔ یہ ڈاکٹر ہیرا لال کے شاگرد تھے اور امراض چشم کے ماہر۔ رفتہ رفتہ ان کے کمالِ فن کی ایسی شہرت ہوئی کہ انہوں نے لاہور کے دو مختلف علاقوں میں اپنا مطب جاری کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ صبح سات بجے سے بارہ بجے دوپہر تک وہ اس تحصیل بازار میں مطب کرتے اور دن کے دو بجے سے رات گئے تک نکلسن روڈ پر مریضوں کو دیکھتے۔

میں نے ان میں ایک صفت دیکھی جس کی نظیر اس زمانے میں کہیں نہیں ملتی۔ غربا کا تو کیا ذکر وہ کسی متوسط الحال شخص سے بھی فیس نہ لیتے تھے۔ اور جو سب سے عجیب بات تھی وہ یہ ہے کہ اچھے اچھے خوشحال مسلمان مریضوں کا بھی مفت علاج کرتے تھے۔ ہندو مریضوں سے منہ مانگی فیس لیتے۔ ان کو میں نے اکثر یہ کہتے سنا کہ مسلمان امیر بھی غریب ہوتا ہے اور ہندو غریب بھی امیر ہوتا ہے۔ ہندو مریضوں سے اتنی فیس مل جاتی ہے جتنی میری ضرورت کے لیے کافی ہو۔

گیتا کا انگریزی ترجمہ

ان کے والد لالہ کرپا رام نے لاہور میں سب سے پہلے ڈاکٹر کیلب سے عینکوں کے شیشے بنانے کا فن سیکھا۔ اور پھر ان شیشوں کو بنانے کا ایک بڑا کارخانہ بنایا۔ یہ بڑے نیک دل بزرگ تھے اور کرشن جی کی گیتا کے والہ و شیدا۔ جب ڈاکٹر کیلب نے گیتا کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو لالہ کرپا رام نے اسے بڑے اہتمام سے چھپوا کر شائع کیا۔ گیتا کا یہ ترجمہ بعض نقادوں کی رائے میں لوک مانیہ تلک اور مسز اینی بیسنٹ کے ترجموں سے زیادہ فصیح اور سلیس ہے۔

تحصیل بازار سے آگے بڑھ کر سید مٹھا بازار کے قریب رائے صاحب لالہ مدن گوپال اور پنڈت پربھودت شاستری کے مکان تھے۔ مجھے ان دونوں نامور ماہرانِ تعلیم کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ پنڈت پربھودت کی دماغی وسعت اور فطری صلاحیت ایک اعجاز کا درجہ رکھتی تھی۔ انہوں نے کئی مضامین میں ایم اے کے امتحانات پاس کیے۔ سنسکرت اور فلسفے سے ان کو خاص شغف تھا۔ جرمنی سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ لیکن جلد ہی انڈین ایجوکیشنل سروس سے منسلک ہو کر کلکتے چلے گئے۔

رائے صاحب مدن گوپال پہلے تو ماڈل سکول لاہور میں انگریزی پڑھاتے تھے بعد میں ریلوے ٹیکنیکل سکول لاہور کے ہیڈ ماسٹر

مقرر ہوئے اور ابھی ملازمت سے سبکدوش نہ ہوئے تھے کہ بارِ ہستی سے سبکدوش ہو گئے ایسا استاد اس زمانے میں بھی خال خال نظر آتا تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کی دیکھ بھال اپنے بچوں کی طرح کرتے تھے۔ اگر کسی طالب علم کو کسی مضمون میں کمزور دیکھتے تو اس سے بیزار ہونے کی بجائے اس پہ خاص طور پر توجہ فرماتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا رعب داب ایسا تھا کہ ان کی مربیانہ شفقت سے حوصلہ پاکر کسی کو ادب کی حد سے گزرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

شورِ محشر

اب پنجاب کے دارالحکومت میں شاعری کا اچھا خاصا چرچا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں میرے والد حکیم شجاع الدین نے اردو زبان کی روز افزوں ہر دلعزیزی سے متاثر ہوکر ایک اردو بزم مشاعرہ کی بنا ڈالی" شورِ محشر" اس بزم مشاعرہ کا آرگن تھا۔ یہ مشاعرہ ہر ہفتے میرے بھائی حکیم امین الدین کے وسیع دیوان خانے میں منعقد ہوتا تھا اور جو کلام وہاں پڑھا جاتا تھا۔ ماہانہ " شورِ محشر" میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے ایڈیٹر ڈاکٹر محمد حسین کے بیٹے خان احمد حسین خاں تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ان کی شہرت ایک ناولسٹ ادیب اور شاعر کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں۔ آگے چل کر انہوں نے" شباب اُردو" کے نام سے ایک ادبی رسالہ بھی شائع کرنا شروع کیا۔ جس نے ادبی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔

سر محمد اقبال بھی جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے ہر ہفتے اس مشاعرے میں اپنی غزل سناتے تھے۔ اس مشاعرے کی ایک محفل میں انہوں نے وہ غزل بھی پڑھی جس کا یہ شعر اب تک پرانے لوگوں کی زبان پر جاری ہے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس غزل کے مقطع سے اقبال کی طبیعت کا وہ رجحان صاف ظاہر ہو جاتا ہے جس نے آخر کار انہیں ان لوگوں کی پیروی سے بے نیاز کر دیا۔ جن کو محض زبان دانی کا دعوٰے تھا اور جن کے اشعار کا تار و پود لکھنؤ اور دلّی کے محاوروں کے تانے بانے کے سوا اور کچھ نہ تھا ؎

اقبال لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

مرزا ارشد گورگانی دہلی سکول کے پیرو تھے اور میر ناظر حسین ناظم لکھنوی زبان کے دلدادہ دونوں کی ٹولیاں جب اس بزم مشاعرہ

میں اپنا اپنا رنگ جمانے کے لیے غزل سرا ہوتیں تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیسؔ اور دبیرؔ کے اکھاڑوں کا نقشہ کھنچ جاتا یطف یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی پنجاب کے شعرا، میر اور مرزا ہی کے زیر قیادت میدان سخن طرازی میں ایک دوسرے سے پنجہ آزما ہوتے رہتے تھے۔ اس بزم مشاعرہ کی مقبولیت اس روئداد سے ظاہر ہے جو "شور محشر" کے پہلے شمارے میں اس بزم کے پہلے مشاعرے سے متعلق چھپی۔ اس کے مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ ان میں اس زمانے کے کیسے کیسے نامور لوگ شامل ہوتے تھے اور اُردو زبان اس وقت پنجاب میں کس حد تک مقبول ہو چکی تھی۔

پہلا جلسہ

"۳۰۔ نومبر ۱۸۸۵ء کو پہلا جلسہ مشاعرے کا جناب حکیم امین الدین بیرسٹر بارایٹ لا کے عالیشان مکان پر شام کے چھ بجے ہوا۔ اس جلسے میں علاوہ مفصلہ ذیل اصحاب کے قریباً تین سو شائقین کی بھیڑ بھاڑ تھی"۔

(۱) جناب حکیم شجاع الدین صاحب شجاع۔ میر مشاعرہ (۲) جناب نواب غلام محبوب سبحانی صاحب محبوب (۳) جناب مرزا عبدالغنی صاحب ارشد دہلوی (۴) جناب منشی محبوب عالم صاحب مالک پیسہ اخبار (۵) جناب منشی عبدالعزیز صاحب مینجر پیسہ اخبار (۶) جناب لالہ موہن لعل صاحب مطلبؔ نائب میر مشاعرہ (۷) جناب میر نثار علی صاحب شہرتؔ (۸) جناب مولوی احمد دین صاحب بی اے پلیڈر (۹) لالہ دھنپت رائے صاحب بی اے ایل ایل بی (۱۰) جناب منشی میران بخش صاحب بیرسٹر ایٹ لا (۱۱) جناب میر ناظر حسین صاحب ناظمؔ (۱۲) جناب لالہ منوہر لال صاحب بی اے (۱۳) جناب مرزا محبوب بیگ صاحب بی اے (۱۴) جناب پنڈت سکھ چین ناتھ درؔ ایم اے (۱۵) جناب لالہ گوبند رام صاحب رئیس لاہور (۱۶) جناب لالہ دل باغ رائے صاحب مالک البرٹ پریس لاہور (۱۷) جناب شیخ دانشمند سقراط صاحب ایم اے (۱۸) جناب منشی شام لال صاحب مجبور (۱۹) جناب مرزا عبدالحسین صاحب عارف (۲۰) جناب حکیم شہباز دین صاحب (۲۱) جناب فقیر سید زین العابدین صاحب پلیڈر (۲۲) جناب منشی غلام حسین صاحب شیداؔ (۲۳) جناب شہزادہ محمد علی صاحب المتخلص بہ شہزادہ (۲۴) جناب آغا سلطان علی صاحب کربلائی (۲۵) جناب سردار گنڈا سنگھ صاحب مشرقؔ (۲۶) جناب مولوی عبدالرؤف خان صاحب رافتؔ بھوپالی۔ ایڈیٹر پیسہ اخبار (۲۷) جناب فقیر سید اقتدار الدین صاحب

(۲۸) جناب خلیفہ نظام الدین صاحب (۲۹) جناب حکیم امین الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا سیکرٹری (۳۰) جناب منشی احمد حسین خان احمد صاحب، اسسٹنٹ سیکرٹری۔

بزم مشاعرہ

اس بزم مشاعرہ کی اہمیت صرف اسی امر سے ظاہر ہے کہ اس میں جناب امیر احمد صاحب امیر استاد جناب نواب صاحب بہادر والی ریاست رام پور جو اس زمانے میں لاہور تشریف لائے ہوئے تھے نہ صرف شریک ہی ہوئے بلکہ مصرعہ طرح پر ایک غزل لکھی اور خود پڑھی اور پھر اس بزم مشاعرہ کا کوکب اقبال ملاحظہ ہو کہ اس کے دوسرے مشاعرے میں اقبال نے لاہور میں سب سے پہلے اپنی غزل پڑھی۔ "شور محشر" کی رُوداد بابت ماہ دسمبر ۱۸۹۵ء میں ان کی غزل پر ان کا نام اس طرح درج ہے۔

"جناب شیخ محمد اقبال صاحب اقبال۔ تلمیذ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی"

اور اس غزل کے مقطع میں انہوں نے خود داغ کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا ہے۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر   مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا

حکیم امینُ الدّین

جب تک میرے والد زندہ رہے۔ شعر و شاعری کے یہ ہنگامے بھی جاری رہے اور "شور محشر" قیامت برپا کرتا رہا۔ میرے والد حکیم شجاع الدین اپنے زمانے کے بلند پایہ شعراء میں سے تھے "داغ ہجراں" کے نام سے ان کی غزلیات کا دیوان اور "خزینۂ حزنیہ" کے نام سے ان کے لکھے ہوئے مرثیوں کا مجموعہ ان کی ادبی کاوشوں کی یادگار ہیں۔ ان تصنیفات کے علاوہ انہوں

نے طب کے علمی اور عملی پہلوؤں پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن سے اس زمانے کے طبیبوں نے بہت فیض پایا۔

ان کی وفات کے بعد میرے بھائی حکیم امین الدین اور میرے دوسرے بھائی حکیم شہباز دین نے اس بزمِ مشاعرہ کو جاری رکھنے کی بہت کوشش کی۔ مگر جو بات ایک دفعہ بگڑ چکی تھی نہ بنی اور جذب صادق کی وہ کشش جو بزرگوں کی شفقت میں تھی نوجوانوں کی ہمت کو نصیب نہ ہوئی لیکن ایک بات ضرور ہوئی کہ وہ صاحبانِ ذوق جنہیں بزمِ مشاعرہ میں شریک ہوکر ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کی کچھ عادت سی ہوگئی تھی۔ اب ہر روز شام کے وقت حکیم شہباز دین کے مکان پر جمع ہو جاتے تھے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان ارباب علم و ادب کی دید کے شائق دور دور سے آتے اور ان کی صحبت سے اکتساب شرف کرتے۔ اس مجلس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔

حکیم شہباز دین

حکیم شہباز دین ایک بہت ہی لاغر اور نحیف انسان تھے۔ مگر ان کے سینے میں ایک ایسا دِل تھا جس میں سمندر کی وسعت اور ابر کی فیاضی تھی۔ وہ جو کچھ کماتے اپنے احباب کی خاطر مدارت پر صرف کر دیتے۔ ان کی زبان کی شیرینی اور ان کی منکسر مزاجی اور مہمان نوازی نے ان کی خاک آستان کو علم و ادب کے درخشاں ستاروں کا آسمان بنا دیا۔

حکیم امین الدین اپنے زمانے میں نہ صرف ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے مشہور تھے بلکہ اپنے اس علم و فضل کے باعث جو انہوں نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں پایا تھا۔ بڑی شہرت رکھتے تھے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں جب وہ تقریر کرنے کے لیے آتے تھے تو ان کی تقریر کو سننے کے لیے لوگ دُور دُور سے آتے اور مسلمانوں کی عظمتِ گذشتہ کے تاریخی واقعات کے آئینے میں اپنی آئندہ نسلوں کے شاندار مستقبل کی جھلک دیکھ کر اپنے دل میں ایک نئی زندگی کی حرارت محسوس کرنے لگتے۔

ان کی آواز میں خدا داد جذب و اثر تھا اور ان کی عبارت میں ان کی وسعتِ نظر کا عکس۔ ان کے تبحرِ علمی کی یہ کیفیت تھی کہ ان کے کتب خانے میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی سینکڑوں ایسی کتابیں موجود تھیں جن پر ان کے قلم کے لکھے ہوئے حواشی ان کی معلومات کی وسعت اور ان کی تنقید کی گہرائی کی روشن دلیل تھے۔

آرزوئے ناتمام

انہوں نے قانون پر بھی کئی کتابیں لکھیں اور اسلامی تاریخ پر بھی بے شمار مضامین تحریر کیے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ جو حضور رسول اکرمؐ کی زندگی کے واقعات اور سیرت کی عظمت کو عہد حاضر کے زاویے سے پرکھنے پر مبنی تھا۔ افسوس کہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور وہ اس آرزوئے ناتمام کو دِل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بازار حکیماں کی جن محفلوں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان کی رونق حکیم امین الدین ہی کے دم سے تھی۔ جب وہ نہ رہے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان محفلوں کی روح بھی قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہے۔

اوپر سر عبدالقادر کے مشہور رسالے "مخزن" کا ذکر آچکا ہے اس کے متعلق یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ جب سر عبدالقادر اپنی سرکاری ملازمت کے مشاغل کے باعث اس رسالے کی ادارت اور اشاعت کے لیے وقت نہ نکال سکے تو انہوں نے یہ کام اپنے ایک عزیز دوست شیخ محمد اکرام بیرسٹر ایٹ لا کے سپرد کر دیا۔ وہ بھی اس رسالے کو بازار حکیماں ہی سے شائع کرتے رہے۔ یہ وہی شیخ محمد اکرام ہیں جنہوں نے بعد میں دہلی جا کر "عصمت" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا جس نے نسوانی طبقات میں بڑا نام پایا۔

"مخزن" کے رسالہ پر شیخ محمد اکرام کے دہلی چلے جانے کے باعث کئی دور آئے۔ ایک زمانے میں شمس العلماء احسان اللہ خاں تاجور اس کے ایڈیٹر رہے اور پھر جب انہوں نے اس سے قطع تعلق کیا تو یہ رسالہ ایک مدت تک مولانا حامد حسین بیدل کی ادارت سے مستفیض رہا۔ جب تک یہ رسالہ شائع ہوتا رہا، اس کا مقام اشاعت بھاٹی دروازے کے کسی نہ کسی کوچے ہی میں شائع ہوتا رہا اور جب تک سر عبدالقادر، شیخ محمد اکرام، مولانا تاجور اور مولانا بیدل اس کے ساتھ متعلق رہے۔ وہ بھاٹی دروازے ہی میں مقیم رہے۔

حکیم فقیر محمدؐ

میں نے اوپر لکھا ہے کہ ہیرا منڈی بازار کے اس کونے پر جہاں یہ بازار ایک طرف بارود خانے کو اور دوسری طرف چوک سرجن سنگھ کو جا نکلتا ہے حکیم فقیر محمد رہتے تھے۔ حکیم فقیر محمد ۱۹۰۹ء میں دلی کے طبیہ کالج سے طبابت کی سند حاصل کر کے لاہور آئے تھے۔ وہ پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبے گکھڑ کے رہنے والے تھے۔ مگر اُردو زبان پر کچھ اس طرح شیدا تھے کہ میں نے انہیں کبھی اُردو کے سوا کسی دوسری زبان میں بات کرتے نہیں سنا فن طبابت میں انہیں وہ دستگاہ حاصل تھی کہ دودمانِ شریف خانی کے کوکب اقبال مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان بھی ان کی ذکاوت تشخیص اور طریقۂ علاج کی تعریف کیا کرتے تھے۔

خطاطی میں انہیں وہ ملکہ حاصل تھا کہ مریض ان کے نسخوں کا صحیح نستعلیق پڑھ کر ہی روبصحت ہوجایا کرتے تھے میں نے اکثر عبدالمجید پرویں رقم کو جو اس زمانے کے ایک صاحبِ کمال خطاط تھے اور اپنی جواہر نگاری کی بدولت پرویں رقم کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اور جن کو اقبال نے اپنی تصنیفات کی کتابت کے لیے منتخب کیا خطاطی کے نکات اور خدوخال کے تناسب کی تعیین کے لیے حکیم فقیر محمد ہی سے مشورہ کرتے دیکھا۔

عبدالمجید پرویں رقم کے بیٹے محمد اقبال جو اپنے نامور باپ کی نسبت سے اپنے مخطوطات کو ابن پرویں رقم کے نام سے منسوب کرتے ہیں ایک مشہور خوشنویس ہیں جب اقبال کے لوحِ مزار پر اعلیٰ حضرت شہنشاہ کجکلاہ ایران نے ان کے قلم سے لکھے ہوئے کتبے دیکھے تو اس قدر محظوظ ہوئے کہ اپنی زبانِ سعادت نشان سے فرمایا "خوشنویسی خوب است"

حکیم فقیر محمد کو مصوری میں بھی بدرجہ اتم مہارت حاصل تھی۔ بڑے خوش لباس، بڑے ہنس مکھ، بڑے شیریں گفتار اور بڑے ملنسار انسان تھے۔ مریض مرض سے کراہ کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے مگر مرض سے شفا پاکر عمر بھر کے لیے ان کے گرویدہ احسان ہوجاتے تھے۔ ضلع جگت پھبتی میں استاد تھے لیکن حفظِ مراتب کا ان کو اس قدر پاس تھا کہ اپنی تقریر اور تحریر کو مناسب اور نامناسب کی تمیز سے کبھی آزاد نہ ہونے دیتے تھے۔

جہاں ان کے کمال فن نے انہیں لاہور کے ہر کہ ومہ کو ان کے دستِ شفا بخش کا دست نگر بنا رکھا تھا وہاں ان کے

حُسنِ مذاق نے ہر بامذاق اہلِ قلم کو بھی ان کا والہ و شیدا کر رکھا تھا۔ فارسی نظم میں اقبال کی پہلی کتاب "اسرارِ خودی" انہیں کے اہتمام میں شائع ہوئی۔ اٹھائیس برس تک ان کا مطب ملجائے روزگار رہا اور ان کی ذات مرجعِ اہلِ کمال۔ ۱۹۳۷ء میں علمِ طب ایک ایسے طبیب سے اور فنِ طبابت ایک ایسے ماہرِ فن سے محروم ہوگیا جس کا بدل اس زمانے میں مشکل اور جس کا نعم البدل ہر زمانے میں ناممکن ہے۔

مشرقی دواخانہ

مشرقی دواخانہ قائم کر کے انہوں نے طبابت یونانی کی وہ کمی پوری کردی جس کے باعث یونانی اطباء کے تجویز کردہ نسخے وزن کی قیود سے آزاد اور تاثیر سے محروم تھے۔ ہر دوا اس کے نام اور وزن کے مطابق اور ہر مرکب اس کے اجزائے ترکیبی کے توازن اور تناسب کے ساتھ اگر کہیں مل سکتا تھا تو اس دواخانے سے۔ یہ دواخانہ ان کے مکان کی نچلی منزل میں اس طرف کو واقع تھا جو راستہ چوک سر جن سنگھ کو جاتا ہے مگر یہ دواخانہ بھی اپنے بانی کے ساتھ معدوم ہوگیا۔

اسی دواخانے کے سامنے ایک کنواں تھا جس کی منڈیر پر رائے بہادر سانجھی مل بدن سے ننگے ایک دھوتی باندھے بیٹھے رہتے تھے۔ اور ہر جانے آنے والے کو اپنے ہاتھ سے کنویں کا ٹھنڈا پانی پلاتے تھے یہ کنواں اپنے آبِ سرد کے باعث شہر بھر میں مشہور تھا۔ رائے بہادر سانجھی مل پنجاب یونیورسٹی کے ان گریجویٹوں میں سے تھے جنہوں نے اس یونیورسٹی کے قیام کے بعد سب سے پہلے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد یہ پروونشل سول سروس سے منسلک ہوگئے اور پنشن پانے کے بعد اپنے آپ کو تمام دنیاوی تعلقات سے منقطع کر کے تیاگ آشرم دھار بیٹھے اور اپنا آخری زمانہ پیاسوں کو ٹھنڈا پانی پلانے اور بھوکوں کو اپنی توفیق کے مطابق کھانا کھلانے میں صرف کر دیا۔ بچوں کو بہت پیار کرتے تھے اور ہر راہ چلتے مسافر کو ذرا سی دیر کے لیے روک کر اپنی میٹھی باتوں سے اس کا دل خوش کر دیا کرتے تھے۔ لوگوں کے دل میں ان کی بڑی عزت تھی اور بڑے بڑے امرا بھی انہیں جھک کر سلام کیا کرتے تھے۔

آغا حشر

ڈاکٹر عاشق حسین نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ آغا حشر بھی بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ یہ اس حد تک تو صحیح ہے کہ جب وہ اپنی کمپنی کے ساتھ لاہور آتے تھے تو بھاٹی دروازے ہی کے باہر اس مکان میں رہتے تھے جو مری کشن تھیٹر سے ملحق تھا جس میں ان کی کمپنی کے کھیل دکھلائے جاتے تھے اور یہ صحیح ہے کہ جب وہ اپنی بیوی کی بیماری کے سلسلہ میں لاہور آئے تو پہلے بھاٹی دروازے ہی کے اندر میرے غریب خانے ہی میں رہے۔ اور اس کے بعد جج بازار میں میاں شمس الدین کے مکان میں رہنے لگے اور جب پھر وہ اپنی فلم کمپنی کا کاروبار چلانے کے لیے لاہور آئے تو اس زمانے میں بھی کچھ عرصے تک میرے ہی مکان میں رہے۔ اس کے بعد وہ ریس کورس روڈ پر ایک بنگلے میں رہنے لگے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

لیکن ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ ممبئی اور کلکتے میں گذرا جب بھی ان کا قیام لاہور میں رہا ان کو ڈرامہ نویسی سے کبھی فرصت نہ ملی کہ وہ لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں کچھ زیادہ حصہ لے سکتے۔ ان ڈراموں میں جو انہوں نے لاہور میں رہ کر لکھے سفید خون، خواب ہستی، اور آنکھ کا نشہ قابل ذکر ہیں۔

شہ نشین بخارچہ

یہ وہ زمانہ ہے جب وہ جج بازار میں میاں شمس الدین کے مکان میں رہتے تھے۔ اس مکان میں ایک شہ نشین تھی جس کے دروازے ایک گلی کی طرف کھلتے تھے اس میں ایک بخارچہ تھا جس میں ایک چھوٹی سی دری بچھی رہتی تھی۔ حشر دن کا بیشتر حصہ اسی بخارچے میں گذارتے تھے۔ ان کی نشست کا سامان بہت مختصر ہوتا تھا۔ ایک دری ایک پنسل اور کچھ سادہ کاغذ۔

اس زمانے میں ان کے دوستوں میں سے حکیم فقیر محمد اور مداحوں میں سے عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت ان سے ملنے آتے تھے۔ میں بھی اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ آغا صاحب کی بیوی کی بیماری روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اس پریشانی

کے باعث ان کی ڈرامہ نگاری کے کام میں ایسے زمانے میں تعطل واقع ہوا جب ہر طرف سے ان کے ڈراموں کی مانگ بڑھ رہی تھی۔ بیوی کی علالت کے دوران میں وہ بہت افسردہ خاطر رہتے تھے۔ آخر کار اپریشن کی نوبت پہنچی جس سے وہ جانبر نہ ہوسکیں جب ہم نے ان کی رفیقۂ حیات کو سپرد خاک کیا تو آغا حشر دیر تک قبر کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر اپنی چھڑی سے قبر کے ساتھ زمین پر ایک مستطیل کا خاکہ کھینچا اور کہا یہ حشر کی قبر ہے۔ اس کے بعد وہ بنارس چلے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں ناگہاں یہ خبر ملی کہ آغا حشر بہت زیادہ بیمار ہیں اور علاج کے لیے لاہور آئے ہیں۔ حکیم فقیر محمد کے علاج اور پنجاب کی آب وہوا اور ایک نئے عزم کی گرمجوشی کی بدولت ان کی صحت جلدی بحال ہوگئی۔

حشر پکچرز

اپنی ذاتی فلم کمپنی "حشر پکچرز" کے سلسلے میں اب وہ اس سرگرمی اور اتنی مستعدی سے کام کرنے لگے کہ میں نے انہیں ان کی جوانی کے زمانے میں بھی اس طرح کام کرتے نہ دیکھا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہمت اور طاقت کا تمام باقی ماندہ سرمایہ جو شاید ایک مدت تک ان کی زندگی کا کفیل ہوتا یک بیک بروئے کار آگیا اور ایک ہی برس میں ختم ہوکر رہ گیا۔ وفات سے دو روز پہلے یہ شعر کہا ؎ کھو چکا جوشِ طاقت پھر ملے دشوار ہے حشر اب صحت میری گرتی ہوئی دیوار ہے

حشر ایک درخشندہ آفتاب کی طرح افقِ ہند پر چمکا اور ایک شہابِ ثاقب کی طرح اپنی تابانیوں کو اپنے ساتھ لے کر گم ہو گیا۔ ۱۸- اپریل ۱۹۳۵ء کو یہ سرمایہ دارِ سرور و کیف اور ہنگامہ آرائے عیش و نشاط اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ حشر لاہور کے مشہور قبرستان میانی شریف میں اسی مستطیل میں دفن ہیں جس کا خاکہ انہوں نے ۱۹۱۶ء میں اپنی بیوی کی قبر سے پیوستہ کھینچا تھا۔ یہ اس نیک بخت بیوی کی محبت کا خراج تھا یا حشر کے خواب کی تعبیر۔ بہر حال یہ سعادت بھاٹی دروازے ہی کو نصیب ہوئی کہ حشر کی زندگی کا ایک اہم حصہ اسی کے جوار میں گذرا اور لاہور ہی کی خاک پاک میں ان کو ابدی راحت نصیب ہوئی۔

آغا حشر نے اردو اور ہندی میں بے شمار ڈرامے لکھے ہیں جو ہمیشہ مقبول ہوئے۔ وہ اپنے آپ کو انڈین شیکسپیئر کہا کرتے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ لقب ان کی ندرتِ تخیل اور ان کے اسلوبِ نگارش کو بہت راس آیا۔

فقیر خاندان

چونکہ ڈاکٹر عاشق حسین نے اپنے مضمون میں پچھلے ساٹھ ستر برس کے عرصے سے بہت دور جا کر فقیر سید عزیز الدین اور فقیر سید نورالدین کا ذکر بھی کیا اور لکھا ہے کہ وہ فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے اور بھاٹی دروازے کے ہی رہنے والے تھے اس لیے لازم آتا ہے کہ ان کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ اور اس معزز خاندان کی عظمت کا کچھ سرسری سا بیان ہو جائے جس سے وہ تعلق رکھتے تھے۔

بھاٹی دروازے کے اندر موتی ٹبے کے کوچے سے شروع ہو کر کوچہ تحصیل تک ایک بازار ہے جسے بازار حکیماں کہتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس کی بنیاد میرے جد امجد حکیم عبداللہ انصاری نے اس زمانے میں ڈالی تھی جب وہ قاضی القضاۃ ہند اور صوبیدار کشمیر تھے۔ ان عالی قدر عہدوں کے علاوہ وہ بہت بڑے طبیب تھے۔ ان کے بھائی حکیم خدا بخش بھی جو نواب محمد زکریا خاں صوبیدار لاہور کے عہد میں وزارت کے عہدے پر ممتاز تھے اور ملک الحکما کے خطاب اور فرزند خانی کے اعزاز سے سرفراز بہت بڑے طبیب اور اپنے تمول اور جود و سخا کے باعث مرجع خلائق تھے۔

قصبہ چونیاں کے بزرگ سید غلام شاہ کے بیٹے سید غلام محی الدین کی شادی حکیم خدا بخش کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے ان کے تین بیٹے تھے۔ فقیر عزیز الدین (متوفی ۱۸۴۵ء) فقیر امام الدین (متوفی ۱۸۴۴ء) اور فقیر نورالدین (متوفی ۱۸۵۲ء) فقیر نورالدین کے دوسرے بیٹوں کے علاوہ فقیر سید شمس الدین (متوفی ۱۸۷۲ء) تھے۔ فقیر سید شمس الدین کے بیٹے سید شہاب الدین تھے اور ان کے بیٹے فقیر سید وحید الدین کے والد فقیر سید نجم الدین تھے۔ چونکہ سید غلام محی الدین کو فقرا سے رغبت تھی اور خود بھی ایک روحانی پیشوا کی حیثیت سے صاحب رشد و ہدایت تھے۔ انہوں نے فقیر کا لقب اختیار کیا اور ان کی اولاد نے بھی اسی لقب کو اپنا سرمایہ افتخار و امتیاز سمجھا

خالصہ دربار

فقیر سید عزیزالدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں وزارت امور خارجہ کے عہدے پر فائز تھے۔ پنجاب کی کسی تاریخ پر بھی نظر ڈالیے تو ظاہر ہو جائے گا کہ خالصہ دربار میں جو عزت فقیر سید عزیزالدین کو حاصل تھی کسی کو نصیب نہ ہوئی وہ صاحبِ قلم بھی تھے اور صاحبِ سیف بھی۔ ان کی دانشوری اور حاضر جوابی کے تذکرے زبان زد خلائق تھے۔

یہ جگہ ان کے سیاسی کارناموں کی تفصیل کے بیان کے لیے موزوں نہیں۔ فقط اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اس بحران کے زمانے میں خالصہ حکومت اور برطانوی ارباب حل وعقد کے مابین جو خط وکتابت یا گفت وشنید ہوتی تھی فقیر سید عزیزالدین ہی کی وساطت سے ہوتی تھی اور ان دونوں حکومتوں کے مابین جو آخری معاہدہ ہوا وہ "عزیزالدین مٹکاف ٹریٹی" ہی کہلاتا ہے۔

فقیر سید عزیزالدین نثر اور نظم دونوں میں مشاق اور اپنے زمانے کے بڑے بلند پایہ ادیب اور طبیب تھے اور آزاد تخلص کرتے تھے۔ ان کا نظموں کا مجموعہ "دیوان آزاد" اب تک پنجاب پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔

فقیر سید نورالدین اپنے بھائی فقیر سید عزیزالدین کی طرح خالصہ دربار میں بڑے مراتب عالی پر فائز رہے۔ ۱۸۱۲ء میں وہ جالندھر کے صوبیدار مقرر ہوئے اور اس کے بعد سیالکوٹ اور وزیر آباد کے پرگنوں کے عامل کی حیثیت سے انہوں نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح صاحبِ قلم اور صاحب سیف تھے اور نہ صرف سیاست کی گتھیوں کو سلجھانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ممد ومعاون رہے بلکہ اپنی عسکری صلاحیتوں کی بدولت بھی انہوں نے بڑا نام پایا۔

کوہ نور ہیرا

شاہ شجاع الملک والی افغانستان جب اپنے وطن اور تخت کو چھوڑ کر لاہور آئے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مہمان ہوئے تو فقیر سید نورالدین ہی نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ "کوہ نور" جیسے مشہور زمانہ اور بے مثال ہیرے سے دستبردار ہو جائیں اور پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو شجاع الملک کی من مانی شرائط اور منہ مانگی قیمت پر رضامند کر کے یہ ہیرا حاصل کیا اور

اسے ان کی کلغی کی زینت بنایا اس تمام واقعہ کی روئیداد فقیر سید نورالدین کے قلم سے فارسی زبان میں لکھی ہوئی اب تک محفوظ ہے یہ شاعر بھی تھے اور منور تخلص کرتے تھے "دیوان منور" کا قلمی نسخہ اب بھی ان کے خاندان میں موجود ہے۔

فقیر سیّد غلام محی الدین کے تیسرے بیٹے میرے پھوپھا فقیر سید امام الدین (متوفی ۱۸۴۴ء) جو عمر میں فقیر سید عزیزالدین سے چھوٹے اور فقیر سید نورالدین سے بڑے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں امرتسر میں قلعہ گوبند گڑھ کے صوبیدار تھے اور شاہی خزانے کے محافظ۔ خالصہ فوج کا تمام اسلحہ بھی انہیں کی تحویل میں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں دربار کا سارا کاروبار انہیں تین نامور بھائیوں کی نگرانی میں انجام پاتا تھا۔

فقیر سید نورالدین کے ایک بیٹے فقیر سید شمس الدین (متوفی ۱۸۷۲ء) تھے۔ یہ بھی میرے پھوپھا تھے یہ بڑے بیدار مغز اور صاحبِ علم و فراست تھے انہوں نے خالصہ حکومت کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد جب پنجاب میں انگریزی تسلط ہوا تو اس زمانے میں بھی اپنے علم و فضل اور بے مثال جرات عمل کی بدولت بڑا نام پایا۔ بہبود عامہ کے سلسلے میں ان کی کارگزاریاں اس زمانے میں جب عمائد حکومت کی تمام تر توجہ اپنے ذاتی مفاد تک محدود تھی بڑی وقعت رکھتی ہیں۔ یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر لاہور کے شہریوں میں اکتساب علم کا شوق پیدا کیا تھا اور اس مقصد کے پیشِ نظر انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی اور پھر پرانی روایات کو بالائے طاق رکھ کر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بھاٹیوں کے میدان میں ایک مدرسہ جاری کیا انگریزی عہد میں یہ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے اور لاہور میونسپل کمیٹی کے رکن بھی وہ فارسی میں بہت اچھا شعر کہتے تھے اور شمس تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تینوں بیٹوں فقیر سید برہان الدین فقیر سید زین العابدین اور فقیر سید شہاب الدین کو دنیاوی

فقیر سیّد شہابُ الدّین

ثروت کے علاوہ علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ ۱۸۸۱ء میں فقیر سید برہان الدین اور فقیر سید زین العابدین نے وکالت کے امتحان میں کامیاب ہو کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور پھر یہ دونوں بھائی مدت تک پنجاب کی مختلف ریاستوں میں وزارت کے عہدوں پر فائز رہے۔

فقیر سید شمس الدین کے تیسرے بیٹے فقیر سید شہاب الدین پہلے تحصیل دار ہوئے اور پھر اپنے علم و فضل کی بدولت

ضلع لاہور کے مدارس کے انسپکٹر مقرر ہوئے یہ میرے والد کے بڑے بھائی حکیم حسام الدین کے داماد تھے اور اس لیے رشتے میں میرے بھائی ہوتے ہیں۔ عربی اور فارسی زبان میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانیؒ کی مشہور کتاب "غنیۃ الطالبین" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں لکھیں، اپنے معزز خاندان کی روایات کے پابند تھے اور نجابت و شرافت کی زندہ تصویر۔ سردی کے موسم میں سبز رنگ کی مخمل کی عبا پہنتے تھے اور اسی رنگ کی مخمل کی چوگوشیہ اوڑھتے تھے۔ اپنے دونوں لاولد بھائیوں کی وفات کے بعد جب اپنے والد کی جاگیر جو لاہور تحصیل میں رکھ راۓ ونڈ کے قریب واقع تھی اور نوسو ایکڑ زمین پر مشتمل وراثت پائی تو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ یہ بھی ہر شام حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آکر بیٹھتے تھے اور اس محفل ادب کی رونق بڑھاتے۔ انہوں نے ۱۹۰۸ء میں انتقال فرمایا۔

فقیر سیّد نجمُ الدّین

ان کے بیٹے فقیر سید نجم الدین جو اس سے پہلے سرکاری ملازمت سے منسلک تھے اپنے نامور والد کی طرح اپنی جاگیر کے انتظام کی مصروفیتوں کے باعث ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ فقیر سید نجم الدین رشتے میں میرے بھتیجے بھی تھے اور بھانجے بھی۔ اپنے ماموں حکیم امین الدین کی صحبت میں رہنے کے باعث انہیں اسلامی تاریخ سے عموماً اور ہسپانیہ کی تاریخ سے خصوصاً بہت دلچسپی ہو ہوگئی اور انہیں کی رہنمائی میں انہوں نے ان مضامین پر بہت سی کتابیں پڑھیں۔ آخر کار وہ سید امیر علی کی ان دو کتابوں "سپرٹ آف اسلام" اور "ہسٹری آف سیراسینز" کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ اس کا اردو ترجمہ کیا۔ میں نے ان کا اردو ترجمہ دیکھا ہے اور ترجمے کے مسودات بھی پڑھے ہیں۔ ان کی یہ کوشش بڑی کامیاب تھی، مگر افسوس کہ ان کی دوسری مصروفیتوں کے باعث یہ دونوں کتابیں زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں۔

ان کی ناگہانی وفات کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ان کے باپ دادا کے قیمتی کتب خانے کی نادر کتابوں کے ساتھ یہ مسودات بھی ضائع ہو گئے یہ ایک ایسا حادثہ ہے جس کا صدمہ میرا دل اب تک محسوس کر رہا ہے۔

فقیر سید نجم الدین کو موسیقی اور مصوری سے بھی بڑا شغف تھا اور دلربا پر تو ان کا ہاتھ ایسا چلتا تھا کہ اس فن کے بڑے

بڑے ماہر بھی ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ اقبال اکثر بااصرار انہیں مجبور کر کے ان سے گھنٹوں ولربا سنتے اور اس وقت ان پر ایک عجیب محویت کا عالم طاری رہتا۔

کرنل فقیر سیّد وحیدُ الدّین

ان کے بیٹوں میں سے فقیر سید وحید الدین نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں فوج میں ملازمت اختیار کی اور ترقی کرتے کرتے کرنل کے بلند مرتبت عہدے پر پہنچ گئے۔ تقسیم ہند کے بعد اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر انہوں نے تجارت کا کاروبار شروع کیا۔ اس سے پہلے ان کے خاندان میں کسی نے تجارت کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ مگر فقیر سید وحید الدین کی ذاتی صلاحیتیں ان کے بڑے کام آئیں اور انہوں نے کئی تجارتی ادارے قائم کیے جو ان کے لیے بہت منفعت بخش ثابت ہوئے لیکن وہ بہت جلد ہی اپنے تجارتی کاروبار کو اپنے بیٹوں کے سپرد کر کے اپنے بزرگوں کی روایات کے مطابق تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں اچھی کتابیں پڑھنے والوں کے دل پر اپنے اندازِ فکر کی ندرت اور اسلوب نگارش کی دلاویزی کا سکہ بٹھا دیا۔

اقبال کی زندگی کے حالات اپنی کتاب "روز گار فقیر" کی دو جلدوں میں ایسی خوبی اور خوش اسلوبی سے قلمبند کیے اور یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اصحاب کبارؓ کی زندگی کے حالات اپنی کتاب "محسنِ اعظم و محسنینؓ" میں ایسی سلیس عبارت اور عام پسند زاویۂ نگاہ سے لکھے کہ اب اس کتاب کا انگریزی اور سندھی میں بھی ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔

آج کل ان کے وقت کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں ہی صرف ہوتا ہے اور میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کہ انہوں نے اس مصروفیت سے اپنے بزرگوں کی روایات تصنیف و تالیف کو قائم رکھا ہے اور اس زمانے میں جب قحط الرجال کے باعث ان کے نامور خاندان کی عظمت کے نشان معدوم ہو چلے تھے انہیں اپنی محنت مشقت اور فطری استعداد سے از سر نو بڑی آب و تاب سے روشن کیا ہے۔ اس خاندان کے سب بزرگ جن کا میں نے ذکر کیا ہے بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں ہی میں رہتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ لاہور میں بازار حکیماں کی وہ مقتدر حیثیت جو اسے صدیوں تک حاصل رہی ہے۔ انہی بزرگوں کی درویشانہ صفات اور بے ریا زندگی کے باعث ہی رہی ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

خزینہ پارینہ

فقیر سید قمر الدین کے پوتے فقیر سید مغیث الدین اب بھی اپنے بزرگوں کی لال حویلی کے اس حصے میں رہتے ہیں جس کا پھاٹک بازار حکیماں میں کھلتا ہے اور انہوں نے اس حویلی کی دوسری منزل کو اپنے بزرگوں کے تبرکات اور زمانۂ قدیم کے عجائبات سے آراستہ کر کے حقیقی معنوں میں ایک خزینۂ پارینہ بنا رکھا ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ مرحوم

میں نے اوپر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا کچھ سرسری سا ذکر کیا ہے ایک تو اس سلسلے میں کہ وہ بھاٹی دروازے کے اندر محلہ جلوٹیاں کے سامنے ایک مکان میں رہتے تھے اور پھر اس سلسلے میں کہ وہ ایک عرصے تک اس محفل علم و ادب کی رونق بنے رہے جو ہر شام بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جمتی تھی۔ میں نے دانستہ ان کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس سے پہلے نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی عظمت کا سکہ اب دنیائے علم و ادب پر اس قدر بیٹھ چکا ہے اور ان کی زندگی کے حالات اور ان کے فکر و ذکر پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ ان کا تعارف محتاج بیان نہیں۔ تاہم بھاٹی دروازے کی سب سے بڑی عظمت جس کی ذاتِ گرامی سے وابستہ ہے اس کا مختصر سا ذکر بھاٹی دروازے کی نسبت سے کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اقبال کو اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق کچھ ایسا صحیح علم نہ تھا۔ جب وہ ایک طویل بیماری کے باعث بہت ضعیف ہو گئے اور اس وقت ان کا یہ اندازہ تھا کہ ان کی عمر ساٹھ برس سے تجاوز کر گئی ہے تو ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اب زیادہ دیر تک زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری عمر ۶۳ برس سے زیادہ نہ ہو جائے اس لیے کہ حضور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عمر جہاں تک یقینی طور پر معلوم ہو سکا ہے ۶۳ برس کی تھی۔ پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے بڑی دھیمی اور پرسوز آواز میں اپنا یہ شعر پڑھا ؎

روزِ محشر اعتبارِ ماست او!   در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

پھر ان کی آواز بھر آگئی اور سسکیاں بھر کر رونے لگے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے بھی اپنی کتاب "ذکرِ اقبال" میں اُن کی ولادت ۲۲۔ ذوالحج ۱۲۸۹ ہجری مطابق ۲۲۔ فروری ۱۸۷۳ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر ان کی وفات کے وقت ۶۵ برس کی ہوتی ہے۔ اس تاریخ کا ماخذ غالباً اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا بیان ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہوتی تو اقبال کی حسرت دل ہی میں رہ جاتی اور ۶۳ برس کی عمر سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہوجانے کی آرزو بر نہ آتی۔ لیکن خدا فقیر سید وحید الدین کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اپنی کتاب روزگارِ فقیر میں بڑی تحقیق کے بعد اقبال کی پیدائش کی تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر ۶۱ برس کی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اگر اس تاریخ پر اعتبار کیا جائے تو اقبال کی آرزو پوری ہوگئی اور وہ ۶۳ برس کی عمر سے پہلے ہی واصل حق ہوگئے۔

زمانہ تعلیم

فقیر سید وحید الدین کے بیان کے مطابق اقبالؒ نے ۱۸۹۳ء میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۹۵ء میں سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ بہرحال جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے یہ امر ثابت ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج کی بی اے کی جماعت میں داخل ہوئے اور انگریزی، فلسفہ، اور عربی کے مضامین لیے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ شور محشر کے ۱۵۔ دسمبر ۱۸۹۵ء کے شمارے سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی غزل اس مشاعرے میں پڑھی جو بازار حکیماں میں اس دن منعقد ہوا اور مجھے اپنے بھائی حکیم امین الدین کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کے مکان پر آنا جانا ۱۸۹۵ء سے ہی شروع ہوگیا تھا۔

اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان ۱۸۹۷ء میں بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ عربی اور انگریزی میں اول آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کئے انہوں نے ایم اے کا امتحان گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے ۱۸۹۹ء میں پاس کیا۔ اس وقت تک اقبالؒ گورنمنٹ کالج کے کواڈرینگل کے کمرہ نمبر ۱ ہی میں رہتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں جب اقبالؒ ایم اے پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے اور پھر کچھ مدت کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے تو وہ بھاٹی دروازے کے اندر اس بالاخانے میں جو محلہ جلوٹیاں کے سامنے گھیشو حلوائی کی دوکان کے اُوپر

واقع ہے، رہنے لگے۔ اقبال ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک اسی مکان میں رہے۔ اس تمام عرصے میں وہ ہر شام کو بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے اور اپنے دوستوں کو کلام سناتے تھے۔

جب انہوں نے انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں پڑھنے کے لیے اپنی نظم "تصویرِ درد" لکھی، تو اسے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سنایا اور اسی طرح ہر سال جب وہ اپنی کوئی نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھتے، اسے جلسہ عام میں پڑھنے سے پہلے اسی بیٹھک میں دوستوں کو سناتے۔ ۱۹۰۱ء میں جب سر عبدالقادر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ "مخزن" بازار حکیماں سے شائع کیا تو اقبالؒ کی پہلی نیچرل نظم جسے شیخ عبدالقادر نے اسی بیٹھک میں سنا تھا، مخزن کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی۔

بانگِ درا کی نظمیں

اقبال کی وہ نظمیں جو انہوں نے انگلستان جانے سے پہلے لکھیں اور جو بعد میں ان کی کتاب "بانگِ درا" میں شائع ہوئیں۔ اس زمانے میں لکھی گئی تھیں جب وہ بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے اور اس لیے اس عظمت کی سعادت جو اقبال سے منسوب ہے بھاٹی دروازے ہی کو نصیب ہے۔

اقبال نے جو نظمیں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان میں رہ کر لکھیں، ان کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اقبال ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس آئے اور وکالت شروع کی۔ اس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے سے اٹھ کر موہن لال روڈ پر جو آجکل اُردو بازار سے موسوم ہے اس باغ کے عقب میں جو بھاٹی اور موری دروازے کے درمیان میں واقع ہے لالہ چونی لال مونگا کے مکان میں رہنے لگے۔ مگر اس مکان میں وہ کچھ زیادہ دیر تک نہ رہے، منشی طاہرالدین کے مشورے سے انہوں نے ۱۹۰۸ء کے ماہ اکتوبر میں انارکلی میں وہ بالاخانہ کرائے پر لے لیا جس میں پہلے سر محمد شفیع وکالت کرتے تھے۔ اس مکان میں وہ ۱۹۲۲ء تک رہے۔ اس نقلِ مکان سے یہ مطلب نہیں کہ ان کا بھاٹی دروازے سے کوئی تعلق نہ رہا بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ حکیم شہباز دین کی بیٹھک کی کشش ان کے دل میں پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی۔

وہ اس تمام عرصہ میں ہر روز شام کو بلاناغہ اپنے کام سے فارغ ہو کر اس بیٹھک میں آ بیٹھتے اور جیسا میں نے اوپر لکھا ہے کہ ان کے دم قدم سے یہ محفل رات گئے تک گرم رہتی۔ وہ تمام نظمیں جو انہوں نے اس زمانے میں لکھیں اور اُن میں "اسرار خودی" کو بہت اہمیت حاصل ہے وہ اپنی پُرانی عادت کے مطابق اسی بیٹھک میں بیٹھ کر اپنے احباب کو سنایا کرتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنی کوئی نظم خلیفہ نظام الدین کو جن کی آواز بہت دلکش اور پُرسوز تھی، پڑھنے کے لیے دے دیا کرتے تھے اور ان کی زبان سے اپنے اشعار سن کر خوش ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ ان نظموں کا بھاٹی دروازے ہی کے سر سہرا ہے۔ تو حقیقت سے کچھ بعید نہ ہو گا۔

نقل مکانی

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ۱۹۲۲ء میں حکیم امین الدین کی وفات کے بعد بازار حکیماں کی یہ پرانی محفل اُجڑی اور ادھر اقبال اسی برس انار کلی کے مکان کو چھوڑ کر میکلوڈ پر ایک بنگلے میں جو اُس زمانے میں سید محمد لطیف مصنف "تاریخ لاہور" کی بیوہ کی ملکیت تھا اُٹھ گئے اور اب ان کی محفل جو کبھی بازار حکیماں میں جمتی تھی کوئینز روڈ پر نواب سر ذوالفقار علی خاں کے دولت کدے زرفشاں میں جمنے لگی۔

اب بھاٹی دروازے سے اقبال کی آمد و رفت کا سلسلہ قریب قریب منقطع ہو گیا۔ مگر وہ شیخ گلاب دین وکیل سے ملنے کے لیے جو اُن کے وطن مالوف سیالکوٹ ہی کے رہنے والے تھے۔ اور مولوی احمد دین وکیل کی مزاج پرسی کے لیے جو اس عرصے میں مسلسل بیمار رہے کبھی کبھی بھاٹی دروازے کی طرف آ نکلتے اور اس طرح چند لمحوں کے لیے بازار حکیماں کی پُرانی محفل کی یاد تازہ ہو جاتی ہاں فقیر سید نجم الدین جو ابھی تک سلسلۂ ملازمت سے منسلک تھے جب کبھی چھٹیوں میں لاہور آتے تو وہ خود جا کر ہر روز انہیں اپنے مکان لال حویلی میں اپنے ساتھ لے آتے۔

اسلامی تاریخ پر بحثیں

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اقبال ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ کبھی ان سے دلربا پر اپنے دلپسند راگ سنتے اور کبھی تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مسلمانان عالم نے جو عروج یا زوال کی منزلیں طے کی تھیں ان کے اسباب پر اپنے خیالات ظاہر فرماتے اور پھر عالم اسلامی کے مستقبل پر ان امید افزا توقعات سے سننے والوں کا دل گرما دیتے جن کی جھلک ان کے اشعار میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ فقیر سید نجم الدین کے اصرار پر اپنا تازہ کلام سناتے۔ ان کی آواز میں ایسا درد اور سوز تھا کہ سننے والے جن میں سے اکثر اگر ان کا اشعار کے معانی کی تہ کو نہ پہنچ سکتے مگر ان کی زبان سے ان کے اشعار سن کر بے تاب ہو جاتے۔

اقبال کی مقبولیّت

اس زمانے میں اقبال کی شاعری مقبول خاص و عام ہو چکی تھی اور ان کا نام ایک ایسا طلسم بن گیا تھا کہ جو شعر بھی ان کے نام سے منسوب ہوتا یا شائع ہوتا لوگ اس کے الفاظ سے نہ صرف متاثر ہی ہوتے بلکہ اس کے مطالب کی گہرائیوں پر غور و فکر کرنے لگ جاتے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب اقبال کا انداز تفکّر اور اسلوب بیان ملک بھر کے تعلیم یافتہ طبقوں کے دل پر عموماً اور مسلمان نوجوانوں کے دل پر خصوصاً ایسا حاوی ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے اسلام کے مستقبل کو اس آئینے میں دیکھنے لگے تھے اور ملک کا ہر برنا و پیر ان کی تصنیفات کو حرزِ جان سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے پھرتا تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کے اس عظیم الشان شاعر کی تصانیف کی اشاعت کی تعیین کر دی جائے کہ اس سے ان کی شاعری کے دور ارتقا کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اقبال کی بعض نظمیں جو "بانگِ درا" میں شائع ہوئیں ان کی شاعری کے

دور ارتقا کی ابتدائی منازل کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مگر وہ ایک مجموعے کی شکل میں ۱۹۲۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں اس سے پہلے ان کی کتابیں "اسرار خودی" ۱۹۱۲ء میں "رموز بے خودی" ۱۹۱۸ء میں اور "پیام مشرق" ۱۹۲۲ء میں شائع ہو چکی تھیں۔

ان کی دوسری کتابیں "زبور عجم" ۱۹۲۷ء میں، "جاوید نامہ" ۱۹۳۲ء میں، "بال جبریل" ۱۹۳۵ء میں، "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ۱۹۳۶ء میں، "ضرب کلیم" بھی ۱۹۳۶ء میں اور "ارمغان حجاز" ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئیں۔

بلاشبہ اکبر الہ آبادی کے اشعار نے در پردہ ہندوستان کے رہنے والوں کی آنکھوں پر سے وہ پردہ اٹھا دیا تھا جو مغربی تہذیب اور تعلیم نے ان پر ڈال رکھا تھا لیکن اقبال کے ان غیر مبہم نظریات نے جو ان کے اشعار کے افق پر درخشاں ستاروں کی طرح اُبھر اُبھر کر ایک نئی صبح زندگی کا پیغام دیتے ہیں مغربی تہذیب کا وہ قلعہ مسمار کر دیا جو مغربی تعلیم کی بنیادوں پر طلباء کے ذہن میں استوار ہوا تھا۔

اس مضمون کے مقتضیات کے پیش نظر شاعر مشرق کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے عظیم المثال جوہر فکر و نظر پر اس جگہ تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈال سکتی مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ :-

دور ہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود   بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

اور یقیناً اقبالؒ وہ مرد حق تھا جو قرن ہا قرن کے بعد پیدا ہوا اور شاید اب دور پر دور گزر جائیں تو بطن گیتی ایسا مردِ حق پیدا نہ کر سکے گی، اور گردش لیل و نہار اس نہان خانہ ہستی کے ہزار در ہزار اسرار فاش کرتی جائے مگر وہ دانائے راز پھر پیدا نہ ہوگا جو ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو عالم اسلام کو ایک حیاتِ نو کا پیغام دے کر خود موت کی آغوش میں سو گیا۔

دانائے راز

اقبالؒ نے اپنی علالت کے زمانے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر کے ایک رباعی کہی تھی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید   نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارے ایں فقیرے   دگر دانائے راز آید کہ ناید

اس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؒ کے ذہن میں اس امکان کا ایک ذرا سا شائبہ ضرور موجود تھا کہ شاید آئندہ کسی زمانے میں پردگی ہائے پارینۂ روزگار کا کوئی دانائے راز پھر پیدا ہو جاتے مگر میں جو اپنے بچپن سے ان کی وفات کے وقت تک سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہا ہوں اور رموز فطرت کے اس رازدان کی قدرت فکر و نظر سے خوب واقف ہوں، انہیں کے ایک شعر پر اُن کی عظمت کی اس مختصر داستان کو ختم کرتا ہوں -

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

سنٹرل ماڈل سکول

مقصد بیان تعلی نہیں مگر جب بھاٹی دروازے کے بازار حکیماں کا ذکر آہی گیا ہے تو یہ بیان خود نمائی پر محمول نہ کیا جائے کہ راقم الحروف نے بھی علم و ادب کی مختلف اصناف میں جو خدمات انجام دی ہیں اسی سرچشمۂ علم و فضل کے آبِ رواں کا ایک جُرعہ اور انہیں دانایانِ آئینِ فطرت کے خوانِ نعمت کا ایک ریزہ ہیں جن کی صحبت کی سعادت خوبیٔ تقدیر سے مجھے نصیب ہوئی -

میں نے ابتدا میں سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں تعلیم پائی یہ مدرسہ اس وقت بھی آجکل کی طرح سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ملحق تھا اور پنجاب کے سررشتۂ تعلیم نے اس بات کا خاص انتظام کر رکھا تھا کہ اس مدرسے کے اساتذہ علم و فضل میں فقید النظیر اور طریقۂ تعلیم میں عدیم المثال ہوں - مولوی سید احمد کبیر، لالہ مدن گوپال، مولوی غلام رسول قریشی، پنڈت پربھو دت شاستری، لالہ سکھ دیال، مرزا احمد سعید، مولوی عبداللہ خاں اور مسٹر پران ناتھ، جہاں تعلیم و تعلّم میں سخت کوش تھے وہاں اپنی شفقت اور شرافت کے باعث طلبا میں ہردلعزیز اور حکام کی نظر میں واجب احترام تھے - یہ مدرسہ میرے زمانۂ تعلیم کے دوران میں ایسے ایسے نامور ہیڈ ماسٹروں کی نگرانی میں سرچشمۂ علوم و فنون رہا جن کے نام جوہر کمال کے ضامن اور سرمایۂ ثقافت و شرافت کے کفیل تھے - رائے بہادر شودیال، رائے بہادر سندرداس سوری، مسٹر ٹائیڈ مین، مسٹر لینگ ہارن، مسٹر وائٹ اور ان سب سے بڑھ کر سنٹرل ٹریننگ کالج کے پرنسپل مسٹر نولٹن وہ شفیق استاد تھے جنہوں نے طلبا

کی نظر میں مدرسے کو گھر سے زیادہ محبوب اور اکتسابِ علم کو جان سے زیادہ عزیز بنا دیا۔ میرے ذہنی نشو و نما کی تربیت بھی انہیں استادوں کے دامانِ عاطفت میں ہوئی۔

مولانا ابوُالکلام آزاد

انہیں ایام میں مجھے ایک ایسی سعادت بھی میسر آئی جس پر میں جس قدر بھی فخر کروں بجا ہے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد جو اس زمانے میں امرتسر کے اخبار "وکیل" کی ادارت کے سلسلے سے امرتسر آئے ہوئے تھے کچھ دنوں کے لیے سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں مولوی غلام رسول کی جگہ ہمیں عربی فارسی اور اردو پڑھانے لگے۔ جب وہ ہمیں سبق دیتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک بحر مواج ہے کہ اُبل پڑا اور حکمت و دانش کا ایک ابرِ محیط ہے کہ فضائے آسمان پر چھا گیا۔ ہم تشنگانِ علم نے اپنی تنگ ظرفی کے باوجود اس بحر بیکراں کی چھال سے اپنے کام و دہن کو سیراب کیا اور ان کی بارشِ دانش کے جتنے لالیٔ آبدار جمع ہو سکتے تھے اُن سے اپنا دامن بھر لیا۔

سنٹرل ماڈل سکول اور ان اساتذہ کرام کا میں نے اس ضمن میں اس لیے ذکر کر دیا ہے کہ یہ دانش گاہ بھی بھاٹی دروازے ہی کے علاقے میں ہے اور وہ اکتسابات علمی جو اس کے طلبا کی ناموری اور شہرت دوام کا باعث ہوئے اسی علاقے کے دامانِ فیض ہی کی نوازش کے مرہون احسان ہیں۔ میرے دل میں کچھ تو اس مدرسے کے ان نامور استادوں کے عتبہ علم و فضل پر ناصیہ فرسائی کر کے اور کچھ ان بزرگوں کے قدموں میں بیٹھ کر جو ہر شام میرے بھائی حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جمع ہو جایا کرتے تھے اپنی زندگی کے ابتدائی حصے ہی میں حصول علم کا شوق اور صنائع ادب کا ذوق پیدا ہو گیا اور میں اپنے لڑکپن ہی میں اپنے مستقبل کو جس کی بہار اب ماضی کی خزاں کے ہاتھوں برباد ہو چکی ہے اور جس کی یاد کے سوا اب کچھ باقی نہیں اردو ادب ہی کی خدمت کے لیے وقف کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا اس باب میں جو کچھ مجھ سے ہو سکا ہے اس کا بیان بہر نوع اپنی ستائش پر محمول ہوگا اور اس سے میرے طبعی انکسار اور فطری عجز کے مجروح ہو جانے کا اندیشہ ہے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے ۱۹۱۹ء میں بازار حکیماں ہی سے سر عبدالقادر اور سر محمد اقبال کی تحریک اور حوصلہ افزائی سے "مخزن" ہی کے نقش قدم پر چل کر ایک پندرہ روزہ ادبی رسالہ "ہزار داستان" اور اس کے ساتھ ساتھ ہی بچوں کے لیے ادب لطیف کا ایک

ہفتہ وار رسالہ "نونہال" شائع کیا۔ یہ دونوں رسالے ۱۹۲۳ء تک میری ذاتی ادارت میں شائع ہوتے رہے اور جب میں اس سال سرکاری ملازمت سے منسلک ہوگیا تو میں نے ان رسالوں کی ادارت اپنے دو نہایت ہی عزیز دلدادگان ادب سید عابد علی عابد اور مسٹر ہادی حسین کو سونپ دی۔ سید عابد علی عابد جن کا نام اب علمی اور ادبی حلقوں میں کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں بعد میں قانون کا امتحان پاس کرکے اور مسٹر ہادی حسین انڈین سول سروس کے منسلک ہوکر جب لاہور باہر چلے گئے تو یہ دونوں رسالے بند ہوگئے۔

میں نے افسانہ نگاری بھی کی ہے سٹیج اور فلم کے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ شعر بھی کہے ہیں لیکن وہ حقیر خدمت جو محض اللہ کی توفیق ہی سے میرے ہاتھوں انجام پائی ہے اور جسے میں اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھتا ہوں یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے اس لفظی ترجمے کو جو قدیم اردو زبان میں حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ نے کیا تھا موجودہ زمانے کی آسان وسلیس زبان کے قالب میں ڈھال دیا ہے اس تالیف کے پانچ پارے شائع ہو چکے ہیں اور باقی زیر طبع ہیں۔

مولانا ظفر علیخاں

میں اس بازار کا ذکر کر چکا ہوں جو شیخو پوریوں کے بازار سے ہیرا منڈی کو جا نکلتا ہے۔ اس کے درمیانی حصے میں ایک مزار ہے جسے "سبز پیر" کا مزار کہتے ہیں۔ اس کے پہلو میں ایک گلی ہے جو "کوچہ سبز پیر" کہلاتی ہے۔ اس گلی سے ملحق ایک احاطے میں ایک کٹڑی تھی جو اپنے مالک کے نام کی نسبت سے "کٹڑی امیر چند" سے موسوم تھی، جب مولانا ظفر علی خاں دکن سے واپس آئے تو اس کٹڑی میں رہنے لگے۔ یہیں سے انہوں نے "پنجاب ریویو" کے نام سے ایک ادبی رسالہ شائع کرنا شروع کیا۔ ان کے والد مولوی سراج الدین احمد خاں اور ان کے دو بھائی مولوی حامد علی خاں (جو آجکل مکتبہ فرینکلن کے ناظم الامور ہیں) اور پروفیسر حمید احمد خاں (جو آجکل پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں) انہی کے ساتھ رہتے تھے۔

جب مولوی عزیز مرزا ایم اے او کالج علی گڑھ کے سیکرٹری حیدر آباد میں ہوم سیکرٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے تو انہوں نے مولانا ظفر علیخاں کو بھی حیدر آباد میں بلا لیا۔ وہاں کچھ ایسی الجھنیں پیدا ہوگئیں کہ برٹش ریذیڈنٹ کو مولوی عزیز مرزا اور مولوی ظفر علیخاں کا حیدر آباد میں رہنا کھٹکنے لگا۔ آخر کار یہ دونوں خود دار اور حق پرست عہدے دار معتوب ہوتے اور رخت سفر

باندھ کر اپنے اپنے وطن کو واپس لوٹ آئے۔

پنجاب میں اُردو کی ترویج و تہذیب کی تاریخ جب لکھی جائے گی تو مولانا ظفر علیخاں کے ادبی کارنامے اس کے سنہری اور روشن باب ہوں گے۔ ان کے سیاسی مشاغل اور ان کے ادبی مصروفیات کے کئی پہلو تھے یہ جگہ ان کی سیاسی اقدار کے جائزے کے لیے موزوں نہیں۔ ہاں! یہ بات کسی قدر وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کے سیاسی رجحانات نے ان کی زندگی کو ہمیشہ مبتلائے آلام رکھا اور نتائج و عواقب کے اعتبار سے بھی یہ خارزار ان کے لیے کانٹوں کی سیج بنا رہا۔

مولانا ظفر علیخاں کا ادبی ذوق اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے ان کی ادبی صلاحیتوں میں ایسی پنہائی اور ہمہ گیری تھی کہ ان کے اشہب فکر پر کسی صنفِ ادب کی راہ بند نہ تھی۔ فکر شعر میں ان کو یہ کمال حاصل تھا کہ فی البدیہہ ایک ہی صحبت میں بیسیوں اشعار موزوں فرما دیتے تھے۔ صحافت کو ان کے زورِ قلم سے جو پایۂ بلند نصیب ہوا اُس سے ایک دنیا آگاہ ہے ترجمے میں ان کو وہ یدطولےٰ حاصل تھا کہ اقبال کی نگاہِ انتخاب اپنے اس مشہور و معروف انگریزی خطبے کے ترجمے کے لیے جو انہوں نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے افتتاح کی تقریب میں پڑھا، مولانا ظفر علی خاں پر پڑی۔ غرض نثر ہو یا نظم ہر جہت میں ہر منزل کو وہ بڑی بے تکلفی سے طے کر جاتے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں اپنی نظم ترنم سے پڑھا کرتے تھے اور وہ المناک سانحہ میرے ذہن میں محفوظ ہے، جب وائی ایم سی اے ہال میں وہ اپنی عمر کے آخری برس میں کسی پرانی یاد سے مجبور ہو کر اپنا کلام ترنم سے پڑھتے کی کوشش میں بے ہوش ہو گئے۔ البتہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ فتحمند شہسوار جس نے ادب کے سنگلاخ میدان میں کئی ہفت خوان طے کیے تھے، زمانے کی دستبرد اور کہن سالی کی یلغار سے گر گیا ہے۔

ان کے سینے میں ایک دردمند دل تھا جو قوم کے درد سے ہمیشہ تڑپا کیا اور ان کے دل کی اس دردمندی کی تہہ میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وہ جذبہ تھا، جس کی بدولت انہیں ہر چیز سے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات سے منسوب ہو محبت تھی۔ نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چمن میں ان کی عقیدت نے وہ گُل کھلائے کہ ان کی خوشبو سے آج تک مشامِ جاں معطر ہے اور تحفظ ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے باب میں انہوں نے وہ جوہر دکھائے جن کا لوہا دنیا مان گئی۔

شمع رسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ پروانہ جب عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سوز سے شعلہ نوا ہوتا تو اس کی نوا سے ایسی بجلیاں کوندتیں کہ سننے والوں کے خرمن صبر و قرار کو جلا کر راکھ کر دیتیں۔ وہ غزل لکھنے بیٹھتا تو ایسی خاردار زمین ڈھونڈتا اور سنگلاخ قافیے تلاش کرتا کہ سامعین تو کیا بڑے بڑے پائے کے شعراء دادِ سخن دیئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ انگریزی زبان کو اردو کا جامہ پہنانا ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اردو ہی کا اترن ہے جو انگریزی نے پہن رکھا تھا۔ غرض ظفر علی خاں کا

اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش، اس کا جذبۂ حریت اور پاس وقارِ قید تحریر میں نہیں آسکتا وہ فطری صلاحیتوں کا ایک مظہرِ عظیم تھا اور قدرت کی نادرہ کاریوں کا ایک پیکرِ جمیل، اگرچہ مولانا ظفر علی خاں نے ایک ایسی عمر پائی جو اس زمانے میں ان کی زندگی کی صعوبتوں اور مصروفیتوں کے پیشِ نظر غیر طبعی اور موجبِ حیرت نظر آتی ہے لیکن ان کا دل جب تک ان کے ہوش و حواس قائم رہے، جوان رہا۔ اس حد تک کہ ان کے عہدِ پیری کی سحر پر ایک پُرکیف شامِ جوانی کا گمان ہوتا تھا۔

اردو زبان کی حمایت میں ان کی جدوجہد ۱۸۹۸ء سے شروع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوؤں نے ملک کے گوشے گوشے میں ہندی زبان کی ترویج اور اس کو سرکاری زبان کی حیثیت سے ہندوستان کی واحد زبان منوانے کی تحریک کا طوفان برپا کر رکھا تھا اور نوابِ محسن الملک اس روز بروز بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو کر میدان میں اتر آئے تھے۔ اگرچہ ظفر علیخاں پر اس وقت عنفوانِ شباب کا عالم تھا، لیکن انہوں نے اپنے نامور باپ مولوی سراج الدین احمد خان کے نقشِ قدم پر چل کر اردو کو نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ ہندوستان بھر کی عام فہم زبان ثابت کرنے کے لیے بڑی جوانمردی سے حصہ لیا۔

جب پہلی جنگِ عظیم کی آگ بھڑک اٹھی تو اخبار "زمیندار" کو ان کی قیادت میں وہ فروغ حاصل ہوا، جو اس سے پہلے کسی اخبار کو نصیب نہ ہوا تھا اور ان کی انشا پردازی کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ دوسروں کے بازار ٹھنڈے پڑ گئے، جو لوگ ان کی صحافی اور سیاسی زندگی سے واقف ہیں خوب جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ایمان کی ہر آزمائش کا کس بے جگری اور حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا اور اپنے وقارِ نفس کے بلند پرچم کو کبھی سرنگوں نہ ہونے دیا۔

آج جبکہ ہمیں سیاسی آزادی نصیب ہے ہم ان مجبوریوں اور معذوریوں کا اندازہ نہیں کر سکتے جو انگریزی عہد میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کے تحفظ کی راہ میں ایک مدت تک حائل رہیں، لیکن کوئی ایسا میدان نہ تھا جس میں توحید کے اس علمبردار نے اپنے زبان اور قلم کے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ قید و بند کی سختیاں، مالی مشکلات کی صعوبتیں، عزیزوں کی مفارقت، دوستوں کی دشمنی، غرض کوئی ایسی آفت نہ تھی جس نے اس مردِ مجاہد کا منہ نہ چڑایا ہو اور اس کے جواب میں خود اپنے ہی منہ پر طمانچہ نہ کھایا ہو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظفر علیخاں کا دل جس خمیر سے بنا تھا وہ اسلامی اخوت کے لیے اجزاء سے اٹھایا گیا تھا جس نے اس کی فطرت کو فطرتِ اسلام کے مترادف اور اُس کے دل کی ہر تڑپ کو مسلمانانِ عالم کے درد کا آئینہ دار بنا دیا۔

منشی محبوبؔ عالم

لاہور کے مشہور و معروف روزنامہ "پیسہ اخبار" کے مالک اور ایڈیٹر منشی محبوب عالم کی زندگی کی ابتدا بھی جہاں تک ان کے صحافی اور ادبی کاروبار کا تعلق ہے اسی بھاٹی دروازے سے ہوئی۔ ان کے لاہور آنے کی داستان بھی بہت عجیب اور سبق آموز ہے۔ وہ گوجرانوالہ کے ایک قصبے فیروز والے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے انہیں پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اگرچہ ان کے مالی حالات بہت ہی نامساعد تھے لیکن بڑی ہمت سے کام لے کر انہوں نے ۱۸۸۷ء میں ایک ہفت روزہ اخبار "ہمت" نامی جاری کیا اور اسی برس ایک دوسرا ہفتہ وار پرچہ "پیسہ اخبار" کے نام سے بھی شائع کرنا شروع کیا۔ یہ آٹھ صفحوں پر چھپتا تھا اور اس کا سالانہ چندہ صرف بارہ آنے تھا۔ اس وقت ان کی عمر ان کے اپنے بیان کے مطابق کوئی بیس بائیس برس کی تھی۔ دن رات کی محنت کے باوجود انہیں فیروز والے کی فضا کچھ ساز گار نظر نہ آئی۔ جتنی پونجی ادھر ادھر سے جمع کی تھی سب ان اخباروں پر لٹا بیٹھے۔

ایک دن جو دل میں سمائی تو ایک چھوٹا سا بستر سر پر رکھ کر پیادہ پا گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور لاہور کا رُخ کیا۔ جب دریائے راوی کے پل کو عبور کیا تو لاہور کے جس بازار میں سب سے پہلے پہنچے وہی بازار تھا جو ٹکسالی دروازے سے بھاٹی دروازے کو جا نکلتا ہے اس زمانے میں بھاٹی دروازے کی اونچی مسجد کے سامنے شیش محل کے کوچے کے پہلو میں گوکل نامی ایک عطار کی دوکان تھی اس کی دوکان کے ساتھ پکی اینٹوں کی چار پانچ سیڑھیاں تھیں۔ اس نووارد مسافر نے سیڑھیوں کو خالی دیکھا تو ان پر اپنا بستر جما دیا۔ منشی محبوب عالم رات بھر سڑک پر لگی ہوئی لالٹین کی روشنی میں گوکل کی دوکان کی "چوکیداری" بھی کرتے اور لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے۔ دن کو بستر لپیٹ کر گوکل کی دوکان میں رکھ دیتے اور خود لاہور سے اپنا اخبار جاری کرنے کی دھن میں دوڑ دھوپ کرتے رہتے۔ گوکل عطار میرے والد اور میرے بھائی کے نسخوں کی دوائیں تیار کرتا تھا۔ ایک دن خدا جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ وہ اس ہونہار نوجوان کو میرے بھائی حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں لے گیا۔ اس بیٹھک میں بیٹھنے والوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ایک دن اسی بیٹھک میں باتوں باتوں میں منشی محبوب عالم نے ایک اخبار جاری کرنے کا ارادہ

ظاہر کیا۔ سب لوگوں نے یہ تجویز پسند کی۔

اللہ اللہ وہ کیا زمانہ تھا اور اس زمانے کے لوگ کیسے بامروت تھے۔ آجکل تو دوستوں کا کیا ذکر بھائی بھائی کا غم نہیں کھاتا۔ اسی لاہور میں ایسے ہزاروں لوگ مارے مارے پھرتے ہوں گے جنھیں اگر ذرا سا سہارا مل جاتا تو ان کی کایا پلٹ جاتی اور ان پہ ایک نئی دنیا کے دروازے کھل جاتے۔ یہ جوہر قابل لاہور میں ایک اجنبی مسافر کی حیثیت سے آیا مگر ان جوہر شناس جوہریوں نے اس جوہر کو پرکھا اور اس کا دل بڑھایا۔ آخر کار "پیسہ اخبار" جاری ہوا اور اسے ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر ایک شخص کی زبان پر پیسہ اخبار ہی کا نام تھا۔

منشی محبوب عالم ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے پنجاب میں صحافت کو ایک نئی روش پر ڈالا۔ ان کے "پیسہ اخبار" سے پہلے لاہور سے صرف دو اخبار نکلتے تھے۔ ایک تو مولوی محرم علی چشتی کا "رفیق ہند" اور دوسرا پنڈت گوپی ناتھ کا "اخبار عام"۔ پیسہ اخبار کی شہرت کے سامنے ان دونوں اخباروں کی شہرت ماند پڑ گئی۔ منشی محبوب عالم اب بھی اکثر شام کے وقت حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے اور دنیا بھر کے سیاسی مسائل پر بحث کرتے۔ جب تک میرے بھائی زندہ رہے یہ سلسلہ جاری رہا۔

جب ۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آئے اور بازار حکیماں کے مشاعروں میں اپنی غزلیں پڑھنے لگے تو منشی محبوب عالم بھی بڑے شوق سے شریک ہوتے۔ ان مشاعروں کی روداد میں منشی محبوب عالم کا نام موجود ہے۔ رفتہ رفتہ انہیں اقبال سے بڑی عقیدت اور محبت ہو گئی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ایک نظم پڑھی جس کے ان اشعار میں اس زمانے کے مولویوں کی چیرہ دستیوں کی طرف اشارہ تھا۔

بھاٹی دروازے کی جانب ایک دن جاتا تھا میں
شام کو گھر بیٹھے رہنا قابلِ الزام ہے
خضر صورت مولوی صاحب کھڑے تھے اِک وہاں
ہم مسلمانوں میں ایسی مولویت عام ہے
وعظ کہتے تھے نہ مُسلم کوئی انگریزی پڑھے
کفر ہے آغاز اس بولی کا کفر انجام ہے

جب اقبال نے یہ نظم "پیسہ اخبار" میں چھپنے کے لیے بھیجی تو منشی محبوب عالم نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اقبال کو غصہ آ گیا اور انہوں نے یہ طنزیہ شعر کہہ ڈالا۔

آج کل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت
نام محبوبانِ عالم کا یوں ہی بدنام ہے

منشی محبوب عالم کی ابتدائی زندگی کوئی پھولوں کی سیج نہ تھی کانٹوں کا بستر تھی۔ شروع شروع میں وہ اپنے اخبار کی کتابت اور سنگسازی خود ہی کرتے تھے جب اخبار چھپ جاتا تو اسے خود ہی گلی گلی پھر کر بیچتے۔ آخر کار ان کی ہمت بارور ہوئی اور انہیں اس کاروبار میں ایسی کامیابی نصیب ہوئی کہ وہ ایک عظیم الشان مطبع کے مالک و مختار بن گئے۔ جب روزانہ "پیسہ اخبار" کی مانگ بڑھی تو انہوں نے اس کا ایک ہفت روزہ ایڈیشن بھی نکالا۔ پھر ایک ہفتہ وار رسالہ "انتخابِ لاجواب" شائع کرنا شروع کیا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ اس کے بعد کم عمر بچوں کے لیے "بچوں کا اخبار" اور عورتوں کے لیے "شریف بیوی" کے نام سے دو رسالے اور زمینداروں کے مفاد اور تحفظ کے لیے "زمیندار" اور "باغبان" کے نام سے دو اور رسالے جاری کیے۔

رفتہ رفتہ ان کی مالی حالت اتنی مستحکم ہو گئی کہ پیسہ اخبار سٹریٹ میں ایک عالیشان مطبع کی دو منزلہ عمارت کے علاوہ مکانوں اور دکانوں کا ایک سلسلہ تعمیر کیا، جن کے کرائے کی رقم ان کے مطبع کی آمدنی سے زیادہ ہو گئی۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منشی محبوب عالم کے اس تمام کاروبار میں ان کے دو چھوٹے بھائیوں منشی عبدالعزیز اور منشی عبدالکریم نے ان کے دوش بدوش بڑی محنت اور تندہی سے کام کیا اور اگر منشی عبدالعزیز کی انتظامی قابلیت اور منشی عبدالکریم کی فنی صلاحیت ان کا ہاتھ نہ بٹاتی تو منشی محبوب عالم کا عزم کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے عبدالحمید نے جو لڑکپن میں میرے ہم جماعت رہے ہیں ان کا کام سنبھالا مگر جب وہ افریقہ چلے گئے تو یہ سارا کاروبار بند ہو گیا۔ عزمِ راسخ اور جفاکشی کا وہ پیکرِ عظیم جو محبوب عالم کے محبوب نام سے موسوم تھا جب تک پیسہ اخبار کا نام زندہ ہے اور صحافت کی دنیا قائم ہے زندہ رہے گا۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام را

مولوی غلام رسول

میں سر عبدالقادر کے مشہور رسالے "مخزن" کے دورِ قدیم کا ذکر کر چکا ہوں۔ جب وہ سرکاری وکیل ہو کر لائل پور چلے گئے اور شیخ محمد اکرام دہلی میں اپنے رسالے "عصمت" کی اشاعت کا کاروبار میں مصروف ہو گئے تو وہ یہ دیکھ کر کہ مخزن

کی پرانی شان قائم نہ رکھ سکیں گے۔ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں مولوی غلام رسول تحصیلدار کے ہاتھ "مخزن" کا کاپی رائٹ گیارہ سو روپے میں بیچ دیا۔ مولوی غلام رسول تحصیلداری کے عہدے سے سبکدوش ہو کر کوئی ایسا کاروبار کرنا چاہتے تھے جس کا تعلق علم و ادب سے ہو پہلے تو انہوں نے ایک چھاپہ خانہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر ایک دارالاشاعت قائم کرنے کی تجویز کی۔ لیکن آخر کار تجربے کے طور پر "مخزن" کا کام کاج سنبھال لیا اور جب تک وہ زندہ رہے "مخزن" کو اس کے پرانے ڈگر پر واپس لانے کی کوشش کرتے رہے اس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے میں کوچہ پٹرنگاں کے قریب اس محلے میں رہتے تھے جو "تلواڑہ جہان داد خان" سے موسوم تھا اور آجکل محلہ اسلام خان کہلاتا ہے۔ اسی محلے میں وہ مکان واقع ہے جہاں سے ۱۹۱۲ء کے بعد "مخزن" شائع ہوتا رہا اور اسی نسبت سے وہ مکان "مخزن بلڈنگ" کے نام سے مشہور ہے۔

سر عبدالقادر اور شیخ محمد اکرام کی علیحدگی کے بعد مولوی غلام رسول کو جو سب سے بڑی مشکل پیش آئی وہ یہ تھی کہ رسالے کے لیے کوئی اچھا ایڈیٹر نہ ملتا تھا۔ آخر کار ان کی قسمت نے یاوری کی مولانا احسان اللہ خان تاجور جو نجیب آباد کے رہنے والے تھے اور لدھیانہ میں "نالۂ بلبل" اور "آفتاب" دو اُردو رسالوں کے ایڈیٹر رہ چکے تھے لاہور آنکلے اور سناتن دھرم مڈل سکول میں جو اس وقت بھاٹی دروازے کے تحصیل بازار اور سید مٹھا بازار کے درمیان ایک گلی میں واقع تھا اور جس کے ہیڈ ماسٹر لالہ رگھوناتھ سہائے تھے اُردو اور فارسی پڑھانے لگے انہیں لالہ رگھوناتھ سہائے کے حسبِ منشا انہوں نے چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے "پریم" نامی ایک رسالہ بھی جاری کیا، مگر وہ اس رسالے کو اپنی ادبی تشنگی کو بجھانے کے لیے محض ایک نظر فریب سراب سمجھتے تھے۔

مولانا تاجور

جب مولوی غلام رسول کو "مخزن" کے لیے ایڈیٹر کی تلاش ہوئی تو ان کی نگاہِ انتخاب مولانا تاجور پر پڑی۔ مولانا تاجور کے دل میں یہ شوق پیدا ہوا کہ مخزن کی پرانی شہرت سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی بزم ادب سجائیں، مگر جو رنگ بگڑ چکا تھا وہ پھر نہ جما۔ کہاں وہ زمانہ تھا کہ مخزن کی بساط ادب اقبال، سر عبدالقادر، مرزا اعجاز حسین، میر نیرنگ، چودھری خوشی محمد، عبدالرشید چشتی، مرزا محمد سعید اور اس دور کے دوسرے نامور ادیبوں اور شاعروں کے دم قدم سے آراستہ تھی اور کہاں یہ زمانہ کہ "مخزن" کے لیے مضمون نگاروں کا تو کیا ذکر کسی موزوں ایڈیٹر کی تلاش بھی مولوی غلام رسول کیلئے بڑی صبر آزما ہو رہی تھی۔

ادبی دُنیا

آخر کار ۱۹۱۶ء میں مولانا تاجور نے "مخزن" کی ایڈیٹری کا کام سنبھالا اور اس کام کو اس انہماک سے شروع کیا کہ مخزن کے دفتر ہی میں اقامت گزیں ہو گئے اور دن رات مخزن کو ایک بار پھر اس بلند مقام پر پہنچانے کے لیے جو اُسے سر عبدالقادر کے زمانے میں حاصل تھا ان کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی، لیکن یہ سلسلہ کچھ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہا ۱۹۲۱ء میں وہ دیال سنگھ کالج لاہور میں فارسی اور اردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے اور اسی سال جسٹس شاہ دین کے بلند اقبال صاحبزادے میاں بشیر احمد بیرسٹرایٹ لاء کے رسالے "ہمایوں" میں بحیثیت مدیر معاون کام کرنا شروع کر دیا۔ مولانا تاجور کی طبیعت میں کچھ ایسی خود پسندی تھی یا یوں کہیے کہ ان کے ذوق ادب کی روش دوسروں کے ذوق ادب کی روش سے ایسی مختلف تھی کہ انہوں نے ۱۹۲۹ء میں اپنا ذاتی رسالہ "ادبی دنیا" شائع کرنا شروع کیا۔ یہ رسالہ بھی ان کے اپنے تحریری اعتراف کے مطابق ان کی انتظامی کوتاہی اور زود اعتمادی کے سبب ان کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں انہوں نے ایک اور اردو رسالہ "شاہکار" کے نام سے جاری کیا اور ساری رہی سہی پونجی اس پر صرف کر دی اس امر کے باوجود کہ ان کے رسالے علم و ادب کے سرمایہ دار تھے ان کو اپنی زندگی کے دن آرام و آسائش سے بسر کرنے کے لیے کوئی سرمایہ دستیاب نہ ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں "اردو مرکز" کے نام سے انہوں نے تصنیف و تالیف کا ایک ادارہ بھی قائم کیا اور پنجاب میں اُردو زبان کو ہر دلعزیز بنانے کے لیے وہ عمر بھر مشاعروں کا اہتمام بھی بڑے شوق و ذوق سے کرتے رہے۔

اُردو زبان

غرض پچیس برس کی لگاتار محنت سے انہوں نے لاہور میں ایک ایسی ادبی فضا پیدا کردی جس نے نہ صرف اُردو زبان کی ترویج کے مسئلے کو مسلمانوں کی نظر میں ایک قومی وقار کا مسئلہ بنا دیا بلکہ ادیبوں اور شاعروں کی ایک ایسی کھیپ تیار کردی کہ گھر گھر شعر و شاعری کے چرچے ہونے لگے ان کے حلقہ ارباب علم کا مشاعرہ ہر ہفتے موری دروازے کے باہر ایس پی ایس کے ہال میں منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس سے پہلے جتنے مشاعرے ہوتے تھے ان کا حلقہ اثر محدود اور مخصوص ہوتا تھا مولانا تاجور نے اپنے مشاعروں پر عمومیت کا کچھ ایسا رنگ چڑھایا کہ خاص و عام بڑے ذوق و شوق سے ان میں شریک ہونے لگے۔ وہ اپنی عمر کے آخری ایام تک اسی سعیٔ پیہم میں سرگرداں رہے کہ پنجاب اُردو زبان کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ بن جائے اور ایک دن ایسا آئے کہ پنجاب کے لکھے پڑھے لوگ اُردو ہی کو اپنی مادری زبان سمجھنے لگیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اُردو نثر اور نظم کی ہر صنف کی اصلاح اس انہماک سے کی جیسے کوئی ایک مقدس فرض ادا کرتا ہے یا جیسے یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن تھا مجھے اس امر کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ دورِ حاضر میں اُردو زبان کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے جب اس کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا تاجور اور مولانا صلاح الدین احمد کے اسمائے گرامی زریں حروف سے لکھے جائیں گے۔ اور میں ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان سب بزرگوں نے اپنی زندگی اپنی صحت اور اپنی عمر بھر کی کمائی اسی بازی پر لگا دی اور اسی دھن میں لٹا دی کہ اُردو زبان کو پنجاب میں روز بروز زیادہ فروغ حاصل ہو۔ آج یہ لوگ خود موجود نہیں ورنہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ان کی محنت اور کاوش رائیگاں نہیں گئی اور اُردو زبان کا وہ عشق جو ان کے دل و دماغ پر ایک جنون کی طرح طاری ہو چکا تھا آخر کار رنگ لا کر ہی رہا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس امر کی طرف تو میں نے اشارہ کر دیا ہے کہ موجودہ صدی کی ابتدا سے اب تک پنجاب میں اُردو کو جو فروغ حاصل ہوا وہ انہی بزرگوں کا مرہون منت ہے اور دورِ حاضر میں پنجاب میں اردو زبان کے جتنے ادیب شاعر اور ہر قسم کے مضمون نگار چاہے وہ ہندو تھے یا مسلمان یا سکھ پیدا کئے ہیں، اگر ان کی حوصلہ افزائی اردو زبان کے یہ نامور سرپرست اور محسن نہ کرتے

اور ان کے رشحاتِ فکر و قلم کی نشر و اشاعت کے باب میں اپنا تن من دھن وقف نہ کر دیتے تو نہ تو کوئی ان نووارد ادیبوں اور شاعروں کے نام ہی سے واقف ہوتا اور نہ اردو کا سرمایۂ ادب ہی اتنا بھرپور ہوتا۔ جتنا اس وقت نظر آتا ہے۔ یہ تو ایک واضح حقیقت ہے کہ دریاؤں کی سیرابی ان ندی نالوں سے ہوتی ہے جو ان چشموں سے بہہ نکلتے ہیں جو پہاڑوں کے قلب و جگر میں پرورش پاتے ہیں۔ یہی کیفیت علم و ادب کے بحرِ بیکراں کی ہے اگر علم و فضل کا آبِ جاری اس سمندر کی آبیاری نہ کرتا رہے اور اس آبِ جاری کو علم و فضل کے وہ سرچشمے اپنے ابرِ کرم سے بہرہ مند کرتے رہیں جنہیں بے پایاں سوتوں کی طرح فطرت نے اس لازوال دولت سے مالا مال کیا ہے تو یہ سمندر بھی خشک ہو جاتے، جن بزرگوں کا میں نے نام لیا ہے علم و فضل کے اسی قسم کے سرچشمے تھے جن کی آبیاری سے علم و ادب کی خشک زراعت پھول پھل لائی اور پنجاب نے اردو زبان کے ایسے سحر نگار ادیب اور شاعر پیدا کیے جنہیں دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے دوش بدوش جگہ مل سکتی ہے۔ اوروں کا تو کیا ذکر میں نے خود انہی بزرگوں کے قدموں میں بیٹھ کر ایسا فیض پایا ہے کہ اس کا احسان نہ ماننا انتہائی ناشکرگزاری ہوگی۔

میری عمر ابھی کوئی سولہ برس ہی کی تھی کہ سر عبدالقادر نے اپنے مقتدر رسالے "مخزن" میں میری ایک نظم جو "جوزفین کے نام نپولین کے ایک منظوم خط" کا ترجمہ تھی۔ شائع کر کے میرا حوصلہ بڑھایا اور میری عمر ابھی ۱۸ برس کی بھی نہ ہوتی تھی کہ

پنجاب ریویو

مولانا ظفر علیخاں نے اپنے جریدہ فریدہ "پنجاب ریویو" میں میری ایک نظم جو میں نے اقبال کی شان میں لکھی تھی شائع کر کے میری دلنوازی کی۔ مولانا تاجور تو ایک عرصے تک میری حقیر تحریروں کو "جواہر قدس" کے عنوان سے "مخزن" میں شائع کرتے رہے اور مجھے اس اعتراف سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اگر علم و فضل کے ان دیوتاؤں کی برکت اردو ادب کے مندر کے ایک عقیدت مند پجاری کی دل سوزی اور عرق ریزی کا چڑھاوا قبول نہ کرتی تو ادب کی مختلف اصناف میں جو تھوڑی

بہت سُوجھ بُوجھ مجھے حاصل ہو سکی ہے کبھی حاصل نہ ہوتی۔

یہ سچ ہے کہ اورینٹل کالج کے عالی قدر اساتذہ نے اس دارالعلوم کی ابتدا ہی سے پنجاب کے چمنستانِ علم وفضل میں اپنے نیسانِ کرم سے ایسے گلہائے تر کی نشوونما کی جن کی مہک سے آج مشامِ عالم معطر ہے۔ لیکن جہاں تک اُردو زبان کی ترویج اور تہذیب کے باب میں ان علمی اور عملی تحریکوں کا تعلق ہے انہیں علم وفضل کے اس نادرِ روزگار سرچشمے سے آبِ رواں سے فیض یاب ہونے کی سعادت میسر نہیں آئی ان بزرگوں کی مساعی قابلِ صد ہزار تحسین ہیں۔

مولانا حامد حسین بیدل

جب مولانا تاجور "مخزن" کی ادارت سے سبکدوش ہوتے تو مولوی غلام رسول "مخزن" کے لیے پھر کوئی ایڈیٹر تلاش کرنے لگے۔ اتفاق سے اس زمانے میں مولانا حامد بیدل بھی فکرِ معاش میں لاہور آئے ہوئے تھے مولانا حامد حسین بیدل کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ متعارف کرا دیا جائے۔ وہ شاہجہان پور کے رہنے والے تھے ان کی نثر اور نظم کا ایک خاص انداز تھا۔ ۱۹۱۱ء میں ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اتنی شہرت حاصل کر چکے تھے کہ جب مولانا محمد علی نے دہلی سے اپنا مشہور عالم روزنامہ "ہمدرد" جاری کیا اور اس کی ایڈیٹری کے لیے مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی اور اس کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے مولوی محفوظ علی بدایونی جیسے مشاہیر کو بلایا تو اخبار کے ایڈیٹوریل سٹاف میں مولانا بیدل کو بھی شامل کر لیا۔ مولانا بیدل حقیقی معنوں میں شاعر تھے بڑے نازک مزاج اور زُود رنج مولانا محمد علی اپنے عملے سے کام لینے میں کسی کی رُو رعایت نہ کرتے تھے جب مولانا بیدل کا زیادہ تر وقت دہلی کی ادبی صحبتوں میں گزرنے لگا اور انہوں نے اپنے فرضِ منصبی سے کچھ غفلت برتی تو مولانا محمد علی ان سے کچھ ایسے بیزار ہوتے کہ انہیں بلاتکلف رخصت کر دیا۔ کچھ روز دہلی میں اس امید میں اِدھر اُدھر پھرتے رہے کہ ان کے جوہر کو پرکھنے والا کوئی جوہری کہیں نہ کہیں مل جائے گا، مگر نہ تو دہلی میں انہیں کوئی ایسا کام میسر آیا جو ان کی پسند کے مطابق ہوتا اور نہ انہوں نے کسی ادبی ادارے ہی کو اس قابل سمجھا کہ ان کے ذوقِ ادب کی تشنگی مٹا سکے۔ اس زمانے میں انہیں روز و شب بسر کرنے کے لیے دو ہی ٹھکانے

میسر آئے۔ ایک تو نظام المشائخ کے ایڈیٹر ملّا واحدی کا دولت کدہ اور ایک پنڈت کے کوچے میں منشی نثار احمد کا مکان ۔

سید ممتاز علی

ملّا واحدی تو اپنے ادبی اور صحافی کارناموں کے باعث اس قدر مشہور ہوئے کہ محتاجِ تعارف نہیں۔ لیکن منشی نثار احمد کو متعارف کرنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے بالخصوص اس لیے کہ جب تک وہ لاہور میں رہے بھاٹی دروازے کے اندر تحصیل بازار ہی میں اس مکان میں رہے جس میں کبھی شمس العلماء سید ممتاز علی رہتے تھے وہ بہت دنوں تک پنجاب میں منصفی کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ اس لیے عوام و خواص میں "منصف صاحب" کے نام سے مشہور تھے۔ فہم ان کی محبت کی وسعت کی ادراک سے قاصر ہے قلم اس مخزنِ احسان و مروّت کے مکارم اخلاق کے اوصاف بیان کرنے سے عاجز ہے ۔
راگ رنگ کے شیدائی اللہ والوں کے نیاز مند دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار تھے۔ پنشن اور جائیداد کا کرایہ اور وہ سب کچھ جو انہیں کسی طرح بھی میسر آسکتا تھا دوستوں کی خاطر مدارت میں اڑا دیتے تھے اور پھر خاطر مدارت بھی ایسی نہیں کہ ان کا جی چاہے مہمان کو کھلائیں بلکہ جو کچھ مہمان کھانا چاہے وہی بہم پہنچایا جاتا تھا وہ دوستوں کی صحبت کے اس قدر شائق تھے کہ خود کرایہ خرچ کرکے انہیں دلی سے بلوایا کرتے تھے اور اس وقت تک واپس نہ جانے دیتے تھے جب تک یہ لوگ یکے بعد دیگرے ان کی آنکھ بچا کر یا کسی نہ کسی ناگزیر ضرورت کا بہانہ کرکے نہ چلے جاتے۔ مولانا بیدل سے میری ملاقات بھی سب سے پہلے انہی کے دولت کدے پر ہوئی۔

ڈپٹی برکت علی خاں

جب مولانا بیدل لاہور آئے تو موچی دروازے کے باہر ڈپٹی برکت علی خاں کی کوٹھی میں ٹھہرے ڈپٹی صاحب بھی

شاہجہان پور کے رہنے والے تھے اور ان کے مہمان خانے کے دروازے ہر اس شخص کے لیے جو دریائے ستلج کے اس پار سے لاہور آ نکلتا۔ دن رات کھلے رہتے تھے۔ اب مولانا بیدل کے دل میں اپنی غریب الوطنی کا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ دوستوں کے کہنے سننے سے انہوں نے ایک بہت ہی قلیل مشاہرے پر "مخزن" کی ایڈیٹری قبول کر لی اور ڈپٹی برکت علی خاں کی کوٹھی سے اٹھ کر "مخزن" کے دفتر میں آ گئے۔ اور ایک مدت تک بھاٹی دروازے کے اسی کوچے میں رہے جس میں "مخزن" کا دفتر واقع تھا۔ "مخزن" کے دفتر سے جو مشاہرہ انہیں ملتا تھا وہ ان کے اخراجات کی کفالت کے لیے کافی نہ تھا۔ میں نے منشی گلاب سنگھ کے چھاپے خانے کے مالک رائے بہادر موہن لال سے کہہ سن کر انہیں پروف ریڈری کا کام دلوا دیا۔ لیکن یہ دونوں کام محنت طلب تھے اور مولانا بیدل محنت سے کوسوں دور بھاگتے تھے میں اس زمانے میں اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا جب مجھے مولانا بیدل جیسا صاحبِ ذوق دوست کچھ پریشان خاطر نظر آیا تو انہیں اپنے مکان پر لے گیا۔ وہ بہت دن تک میرے پاس رہے اور پھر دہلی چلے گئے اور غالباً اپنی زندگی کے آخری ایام انہوں نے دہلی میں جسے وہ ہمیشہ جہان آباد کہا کرتے تھے گزار دیئے۔

ماخذ

ڈاکٹر عاشق حسین کی خواہش کے مطابق میں نے بھاٹی دروازے کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مختصر سا ذکر کر دیا ہے لیکن یہ اجمال اب بھی تفصیل چاہتا ہے اگر زندگی نے فرصت دی تو شاید یہ تفصیل بھی کبھی قلمبند ہو جائے۔ اس مضمون میں میں نے بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جو میرے ذہن میں محفوظ تھیں لیکن سنین، واقعات اور بعض دوسرے تعینات کی صحت کے پیش نظر میں نے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کی تاریخ جسے ڈاکٹر غلام حسین نے بڑی محنت اور تلاش سے مرتب کیا ہے اور سر لیپل گرفن کی مشہور تالیف "تذکرہ روسائے پنجاب" سے استفادہ کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔ یہ دونوں معتبر اور مستند ذرائع اگر دستیاب نہ ہوتے تو یہ مضمون تشنہ استاد رہ جاتا اور اس لیے ان دونوں کتابوں کے مولفین کا غائبانہ شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی تاریخ ولادت اور کئی دوسری معتبر معلومات کے لیے میں حیاتِ اقبال

پرفقیر سید وحیدالدین کی بے مثال کتاب "روزگارِ فقیر" کا مرہونِ منّت ہوں ۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ایک نثری اشاعت کے مقتضیات کے اعتبار سے یہ مضمون اختصار کی حد سے کسی قدر گُذر گیا ہے مگر ؏ لطیف بود حکایت دراز تر گُفتم

اشاریہ

پیکیجز لمیٹڈ لاہور